اے حمید

پہلا اداس چاند

اے حمید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

(1)

دسمبر کی ایک انتہائی سرد اور کہر میں ڈوبی ہوئی رات تھی۔ میکلوڈ روڈ کے ہوٹلوں کے دروازے بند تھے۔ اور اندر بیٹھے اکا دکا لوگ گرم گرم چائے پی رہے تھے۔ سڑک پر دور تک دھند پھیلی ہوئی تھی، دو روز پہلے کی بارش نے سردی کی شدت میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ لکشمی کے چوک میں کہیں کہیں کسی پنواڑی کی دکان کھلی تھی۔ کبیر کوئینز روڈ کی جانب سے رائل پارک کے محلے میں داخل ہوا۔ اس کا قد درمیانہ، جسم دبلا پتلا اور سر کے بال سیدھے تھے جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ کوئی پینتیس برس کی عمر ہوگی۔ آنکھیں سیاہ تھیں، اور گہرے فکر کے انداز میں سمٹی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر سے ایک قسم کی خوش فکری اور بے نیازی ہویدا تھی۔ ماتھا چوڑا تھا۔ رنگ گندمی اور ناک کے نتھنے فراخ تھے۔ جو اس کی کشادہ دلی اور جذباتی طبیعت کی علامت تھے۔ اس نے مٹیالے سے رنگ کا ایک لمبا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ کے کالر اٹھے ہوئے تھے۔ کندھے پر ایک جگہ سے بخیہ ادھڑ گیا تھا۔ پاؤں میں جوتے تھے جن پر گرد پڑا تھا۔ گرم پتلون کے پائنچے پر پان کی پیک کا داغ پڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے۔ سر پہ نسواری رنگ کی اونی ٹوپی تھی۔ اس کے اردگرد رائل پارک کی اونچی اونچی عمارتوں میں گہرا سکوت اور اندھیرا چھا رہا تھا۔ دھند میں یہ عمارتیں سردی کی وجہ سے سکڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کسی جگہ روشندان کی زرد آنکھ میں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ گلیوں کی ساری دکانیں بند تھیں۔ لوگ اپنے اپنے تفکرات، غم و اندوہ اور جعل سازیوں کو ساتھ لئے گرم لحافوں میں دبکے سو رہے تھے۔ اس محلے میں ایک جگہ کبیر بھی رہتا تھا۔ اس نے ایک عمارت میں کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں اس کا ایک دوست احسان رہتا تھا۔ جو ریلوے میں کلرک تھا۔ کبیر جب ایک گلی کا موڑ گھوم کر ایک مکان کے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اچانک ٹھٹھک گیا۔ اس کے دوست احسان کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ باتیں کرنے والے کا لہجہ قدرے تلخ تھا، کبیر

نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا کر سنا۔ وہ آدمی احسان سے کہہ رہا تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ کبیر صاحب ایک عرصے سے بیکار ہیں۔ لیکن صاحب میں کیا کروں؟ میں اپنے بچوں کو کہاں سے کھلاؤں؟ اگر اسی طرح میں لوگوں کو قرض دے کر چپکے بیٹھا رہوں تو بتایئے میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟"

احسان اسے کہہ رہا تھا۔

"ملک صاحب آپ بھی سچے ہیں اور کبیر بھی سچا ہے۔ آپ کو اپنا قرض واپس نہ ملا تو آپ اپنے بچوں کو کہاں سے کھلائیں گے؟ اور کبیر کو جب تک نوکری نہ ملے وہ آپ کے روپے کہیں سے واپس نہیں کر سکتا۔"

"نہیں صاحب میں نے ان کی نوکری کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ آج تو میں اپنا روپیہ لے کر ہی یہاں سے ٹلوں گا۔ غضب خدا کا دو سال ہو گئے۔ تین سو روپوں میں سے ایک پائی بھی ادا نہیں کی! میں تو یہاں دھرنا مار کر بیٹھا ہوں 'اب....."

کبیر نے دب کر کندھے سکیڑے اور بھیگی بلی بن کر کان لپیٹ وہاں سے واپس ہو گیا۔ جلدی جلدی گلی میں سے نکلا اور کو تیز روڈ پر اسمبلی ہال کی طرف چل پڑا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ رات سٹیشن پر کسی پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی کے ڈبے یا بنچ پر بیٹھ کر بسر کی جائے۔ سٹیشن پر رات بسر کرنا کبیر کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ رائل پارک والے کمرے میں آنے سے پیشتر اس نے کئی راتیں سٹیشن پر بسر کی تھیں۔ ایک بار وہ رات کو پلیٹ فارم نمبر پانچ پر کھڑی خالی گاڑی کے ایک ڈبے میں پڑ کر سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی کھیوڑہ کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اس نے سوچا چلو ذرا کھیوڑہ کی سیر ہو جائے۔ چنانچہ دن بھر اس نے نمک کی کانوں کی سیر کی اور اگلے روز رات کو واپس لاہور آیا۔

آج بھی وہ سٹیشن پر سونے کے لئے ایبٹ روڈ پر سے ہوتا ہوا ایمپریس روڈ کی طرف آ گیا۔ سردی بڑے غضب کی پڑ رہی تھی۔ سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ کوٹھیوں کے دروازے بند تھے ' باغوں میں اوس گر رہی تھی۔ کھڑکیوں اور روشندانوں پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ کبیر سر جھکائے 'کندھے سکوڑے ' دونوں ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں میں دیئے فٹ پاتھ پر چپ چاپ چلا رہا تھا۔ گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک دستہ گشت کرتا ہوا اس کے قریب سے گذر گیا۔ ایک سپاہی نے غور سے کبیر کی طرف دیکھا اور پھر

آگے چل دیا۔ سٹیشن کی تمام بتیاں جل رہی تھیں۔ پہلے اور دوسرے درجے کا احاطہ ویران ویران تھا۔ لیکن تیسرے درجے کے احاطے میں رونق تھی ' لوگ بنچوں پر اور زمین پر گندے مندے لحاف اوڑھے یا سو رہے تھے اور یا بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اور باتیں کر رہے تھے۔ چائے کے سٹال پر کچھ لوگ کھڑے گرم گرم چائے پی رہے تھے۔ کبیر یہاں سے گذر کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ یہاں بھی چاروں طرف ویرانی تھی۔ ایک انجن شنٹ کرتا شور مچاتا لائن پر سے گذر گیا۔ بنچ پر لیٹے ہوئے ایک آدمی نے لحاف میں سے منہ باہر نکال کر دیکھا اور پھر سر لحاف کے اندر کر لیا۔

اتفاق سے پلیٹ فارم پر کوئی گاڑی نہیں تھی۔ بنچ سارے کے سارے رکے ہوئے تھے۔ ہر بنچ پر کوئی نہ کوئی لحاف کسی نہ کسی انسان کو اپنی آغوش میں دبوچے پڑا تھا۔ کبیر نے ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ انٹر کلاس کے ویٹنگ روم میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی ' جب کبیر فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں داخل ہونے لگا۔ تو اس نے دیکھا کہ دروازے میں اندر کی جانب چوکیدار انگیٹھی سلگائے ہاتھ تاپ رہا تھا۔ کبیر نے کہا۔

"کہو یار کیا حال ہے؟"

چوکیدار اٹھ کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"آج اتنی دیر بعد آئے ہو۔ اٹھنی لئے بغیر اندر نہ جانے دوں گا۔"

کبیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نیند کا سودا کرتے ہو یار"۔

"کیا کروں پھر؟ کھاؤں کہاں سے؟"

"لیکن میرے پاس تو اٹھنی نہیں ہے"۔

"پھر آج کی رات پلیٹ فارم پر ٹہل کر بسر کرو۔ اندر بھی جگہ نہیں ہے۔ صاحب لوگ آرام کر رہے ہیں"۔

کبیر نے گردن پھیر کر دیکھا۔ غسل خانے سے آنے والی ہلکی ہلکی روشنی میں اندر ہر کرسی پر میز پر کوئی نہ کوئی "صاحب" قیمتی لحاف میں گرم ہو کر سو رہا تھا۔ کبیر نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے چوکیدار سے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ جتنے لوگ سو رہے ہیں سب آرام کر رہے ہیں؟"

چوکیدار نے سر جھٹک کر کہا۔

"بابو تم ایک سال کے بعد آئے ہو۔ تمہاری باتیں نہ پہلے کبھی میری سمجھ میں آئی تھیں اور نہ اب میں انہیں سمجھتا ہوں۔"

کبیر نے مسکرا کر کہا۔

"میں اگر ایک ہزار سال بعد بھی آیا اور تم یہیں موجود ہوئے تو تمہارا یہی جواب ہوگا"۔

چوکیدار کبیر کا منہ دیکھتا رہا اور وہ دروازہ کھول کر باہر پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ پلیٹ فارم سردی میں ٹھٹھرا پڑا تھا۔ ننگا' ٹھنڈا اور برف کی سل کی طرح--- ایک قلی پارسل آفس میں سے ٹوکریاں نکال کر ریڑھی پر لاد رہا تھا۔ جب اس نے ٹوکریاں لاد لیں تو ریڑھی کو لے کر دوسرے پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا اور دھند میں غائب ہو گیا۔ کبیر نے خالی پیٹ فارم کے دو ایک چکر لگائے۔ پھر ایک بند بک سٹال کے تختوں سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اور سگریٹ پینے لگا۔ نیند اسے بالکل نہیں آ رہی تھی۔ ہاں سردی ضرور لگ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بند کمرے میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ جائے اور ساری رات گذار دے۔ کبیر کو رات کو سونا پسند نہیں تھا۔ وہ اکثر راتوں کو جاگتا اور دن کو سویا کرتا تھا۔ رات کو سوتے ہوئے اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی کے ہاں مہمان بن کر اترے اور جاتے ہوئے ان کی کوئی چیز اٹھا کر لے جائے۔ رات کو جاگتے چھوڑ کر وہ نہیں سو سکتا تھا۔ جب تک رات جاگتی وہ کوشش کرتا کہ خود بھی جاگتا رہے لیکن اکثر اسے نیند آ جاتی اور وہ سو جاتا۔ پھر منہ اندھیرے ہی اٹھ کر باہر نکل آتا اور گلی کوچوں کے باہر والے باغوں اور کھیتوں میں چکر لگایا کرتا۔ اسے دوسروں کو سوتا ہوا دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ جس طرح نیک آدمی کسی کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح کبیر دوسروں کو سوتا دیکھ کر عبرت پکڑا کرتا۔ اسے یہ محسوس کر کے فخر سا محسوس ہوتا کہ وہ نیچر کے ساتھ جاگ رہا ہے۔ نیچر جو کبھی نہیں سوتی۔ جس کا جاگنا ہی سب سے بڑا آرام ہے۔

اس کے باوجود کبیر تمام انسانی کمزوریوں کا مجموعہ تھا۔ جب اس پر نیند حملہ کرتی تو وہ اس کا وار نہ بچا سکتا اور بے سدھ ہو کر پڑ جاتا۔ لیکن وہ آخری دم تک اس کا مقابلہ کرتا اور صرف اس وقت شکست قبول کرتا جب کوئی چارہ کار نہ رہتا۔ نیند کا تو وہ مقابلہ کر سکتا تھا۔ مگر سردی کا وہ اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقابلے کے لئے گرم کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اور کبیر کے پاس صرف ایک پوری آستینوں کا سویٹر اور

ایک اوورکوٹ تھا اور کوٹ کندھے پر سے ادھڑا ہوا تھا۔ یہ کوٹ کبیر نے دو سال ہوئے لنڈا بازار سے خریدا تھا۔ یہ کوٹ صرف ایک بار دھلوایا گیا تھا۔ اس کے کالر اور کفوں پر تھوڑا تھوڑا میل جم رہا تھا۔ یہ کوٹ کبیر کو لوگوں کی تیز نظروں سے تو ضرور بچاتا تھا۔ مگر سردی سے اتنا زیادہ محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ خاص طور پر دسمبر کے آخری اور جنوری کے شروع کے دنوں میں جب بارشیں بھی ہو جایا کرتیں کبیر کو راتوں کی آوارہ گردی کرتے ہوئے اس کوٹ میں سردی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اس وقت بھی کبیر کو تھوڑی تھوڑی سردی لگ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ اور دوسرا ہاتھ اس نے گریبان کے پاس کوٹ کے اندر ڈال رکھا تھا۔ کچھ دیر کتابوں کے بند سٹال کے ساتھ لگ کر کھڑا رہنے کے بعد کبیر نے سگریٹ پھینکا اور ریلوے سٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

سڑکوں پر دھند معلق تھی۔ کارپوریشن کی بتیاں جل رہی تھیں اور بڑی کمزور روشنی دے رہی تھیں' سخت سردی میں سڑکیں سنسان تھیں' ایک مکان کے قریب سے گذرتے ہوئے کبیر نے کسی بچے کے رونے کی آواز سنی۔ یہ آواز بند مکان کے اندر لحاف سے آ رہی تھی۔ کبیر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس مسکراہٹ میں معصومیت بھی تھی۔ اور ہلکا ہلکا طنز بھی۔ ایک کتا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں منہ مار رہا تھا۔ کبیر کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ گندے نالے کی طرف ٹھٹھرتا ہوا بھاگ گیا۔ ادھر ادھر سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد کبیر اپنے محلے کے گرد و نواح میں آ گیا۔ ایک گلی کا موڑ گھومتے ہوئے کبیر کو ایک سپاہی نے روک لیا۔

"کون ہو بھئی؟"

"آدمی"۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں"۔

"پھر؟"

"اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"گھر جا رہا ہوں"۔

"کدھر سے آئے ہو؟"

"سٹیشن سے"۔

"وہاں کیا کرنے گئے تھے؟"

"سیر کرنے"۔

سپاہی نے آگے بڑھ کر غور سے کبیر کا چہرہ دیکھا۔

"رات کو کون سیر کرتا ہے؟"

"میں"۔

سپاہی نے کبیر کا بازو پکڑ کر کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا"۔

"چلو"۔

سپاہی کبیر کو ساتھ لے کر تھانے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں دونوں چپ رہے اور کوئی نہ بولا۔ سپاہی حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیسا آدمی ہے کہ اتنی رات کو ' اتنی سخت سردی میں اس کے ساتھ بغیر حیل و حجت تھانے چلنے پر رضامند ہو گیا۔ اس نے ایک بار بھی سپاہی کو یہ نہ کہا کہ معاف کر دیں اور پھر رشوت کی پیش کش نہ کی۔ دراصل سپاہی کا مقصد ہی رشوت لینا تھا۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ سخت سردی میں کسی شخص کو لے کر تھانے تک کا راستہ پیدل طے کرتا پھرے۔ چنانچہ آدھے راستے میں ہی سپاہی نے ہمت ہار دی۔ اس نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس کچھ ہے؟"

کبیر نے چہرہ اٹھائے بغیر کہا

"چار سگریٹ۔ ایک دیا سلائی کا بکس۔ ایک سویٹر۔ ایک اوورکوٹ ...."

سپاہی نے جھنجلا کر کہا۔

"ارے کچھ نقدی وقدی بھی ہے کہ نہیں؟"

"نہیں"۔

"کھاتے کہاں سے ہو؟"

"جہاں سے کھانا ملتا ہے"۔

سپاہی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"جاؤ بابا میری جان چھوڑو"۔

سپاہی پیچھے مڑ گیا۔ کبیر آگے چلتا رہا۔ چوک میں جا کر وہ ایک ' ایسی گلی میں مڑ گیا جو آگے چل کر اس کے مکان کی طرف جا نکلتی تھی۔ گلی ویران تھی۔ یخ بستہ سردی میں ٹھٹھرے ہوئے مکان دھند میں سمٹے کھڑے تھے۔ کسی بھی مکان میں روشنی

نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ یہ خالی مکان ہیں اور ان میں ایک بھی زندہ انسان نہیں بس رہا۔ حالانکہ ایک ایک مکان میں چار چار کنبے آباد تھے۔ یہ کتنی قابل افسوس بات تھی کہ دن کو جو مکان زندگی سے بھرپور ہو رات کو وہی قبر کی طرح چپ چاپ اور سنسان ہو جائے۔ کبیر کا سگریٹ پینے کو جی چاہا۔ لیکن سردی میں ہاتھ باہر نکالنے کو اس کا جی نہ چاہا۔ وہ ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں اور دوسرا ہاتھ گریبان کے اندر ڈالے۔ چپ چاپ سر جھکائے گلی میں سے گزرتا گیا۔ ایک جگہ موڑ گھومتے ہوئے کبیر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک لڑکی کالے رنگ کی چھوٹی سی گٹھڑی ہاتھوں میں تھامے ایک مکان کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ سیاہ برقعہ ' چہرے پر سے نقاب اٹھا ہوا۔ کھلتا رنگ ' دبلا پتلا جسم اور کمیٹی کے بلب کی ہلکی روشنی میں چمکتی ہوئی گھبرائی ہوئی آنکھیں۔ کبیر رک گیا۔ لڑکی نے وہاں سے بھاگنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ کبیر نے پاس جا کر پوچھا

"اتنی رات گئے۔ اتنی سردی میں تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

لڑکی اپنی کالی کالی چمکیلی آنکھوں سے کبیر کو دیکھتی رہی۔ اور کچھ نہ بولی۔ کبیر نے ایک بار پھر پوچھا۔

"تم کون ہو"۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کبیر نے پوچھا۔

"کیا تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟"

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ کبیر نے سر جھکا لیا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔

"تم پہلے کہاں رہتی تھیں؟"

لڑکی نے آہستہ سے کہا

"اپنے گھر میں"۔

"اور اب؟"

"کہیں بھی نہیں"۔

لڑکی کی آواز میں اعتماد اور قوت ارادی کی جھلک تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی مورتی کی طرح اپنی جگہ پر پختہ سنجیدگی سے ٹکا ہوا تھا۔ وہاں نہ تو مسکراہٹ کا نشان تھا اور نہ ہی پریشانی کے آثار تھے۔ صرف ایک اداسی کا سایہ تھا جس نے اس لڑکی کے

سارے وجود کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کبیر نے پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں؟"

"نہیں"۔

"میرے پاس بھی نہیں --- اچھا جاتا ہوں۔"

کبیر چلنے لگا تو اس اداس لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

"کیا تم ایک بے سہارا لڑکی کی مدد نہ کرو گے؟"

کبیر نے اس لڑکی کے پاس آ کر کہا۔

"تم مجھ سے کیسی مدد چاہتی ہو؟"

"مجھے رات بسر کرنے کے لئے جگہ چاہئے۔"

کبیر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔

"اچھا۔ آؤ میرے ساتھ"۔

لڑکی کبیر کے ساتھ ہو گئی۔ کبیر اسے دو ایک گلیوں میں سے پھرا کر اپنے مکان کے پاس لے آیا۔ اس نے لڑکی کو ایک طرف کھڑا کیا اور کہنے لگا۔

"تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں"۔

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کبیر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا اپنے مکان کے پاس گیا۔ اندر بتی بجھی ہوئی تھی۔ بند دروازے کے ساتھ کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کبیر خوش ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کے ایک پٹ کو اندر دھکیلا دروازہ کھلا تھا۔ کبیر مسکراتا ہوا لڑکی کے پاس واپس آیا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ لڑکی کبیر کے ساتھ ہو لی۔ وہ لڑکی کو لے کر مکان کے آنگن میں آ گیا۔ اس نے اپنے کمرے کے پاس جا کر تالا کھولا اور بولا۔

"اندر آ جاؤ"۔

لڑکی اندر آ گئی۔ کبیر نے دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی۔ کبیر نے جیب سے موم بتی نکال کر جلائی اور میز پر لگا دی۔ لڑکی نے پوچھا۔

"کیا یہاں بجلی نہیں ہے؟"

"تھی۔ لیکن مالک مکان کاٹ کر لے گیا۔"

"کیوں؟"

"تین ماہ سے اس کمرے کا کرایہ نہیں دیا"۔

لڑکی نے موم بتی کی دھیمی روشنی میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کمرے میں سوائے ایک چارپائی، پرانی سی میز، ایک آرام کرسی، ایک صراحی اور شیشے کے گلاس کے اور کچھ نہیں تھا۔ آدھا میز پرانی کتابوں نے گھیر رکھا تھا۔ چارپائی پر میلا سا لحاف اور بستر کھلا پڑا تھا۔ دیوار پر ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ جس میں لاہور کی بادشاہی مسجد کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ کبیر نے آرام کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تم چارپائی پر سو جاؤ"۔

"اور تم"۔

"میں اس کرسی پر سو رہوں گا"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم کیا چاہتی ہو کہ تم آرام کرسی پر سوؤ اور میں چارپائی پر آرام کروں؟"

"میرا مطلب تھا۔ میرا مطلب تھا کہ......"

کبیر نے چارپائی پر سے کمبل اٹھا کر اوپر لیتے ہوئے کہا۔

"اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ تم چارپائی پر لیٹو اور میں اس کرسی پر پڑا رہوں۔"

"کیا اس کرسی پر تمہیں نیند آ جائے گی؟"

"ویسے تو نیند ہمیشہ میرے تعاقب میں رہتی ہے اور اگر آج وہ نہ بھی آئے تو کم از کم رات تو گذر ہی جائے گی۔"

"لیکن آپ کیسے سوئیں گے؟"

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں بھی چارپائی پر تمہارے ساتھ لیٹوں؟"

لڑکی نے منہ دوسری طرف کر لیا اور برقعہ اتارنے لگی۔ کبیر نے اپنے آپ کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر ٹانگیں فرش پر پھیلا دیں۔ برقعہ اتار کر لڑکی نے کیلنڈر والے کیل کے ساتھ لٹکا دیا۔ کبیر نے کہا۔

"تم نے بادشاہی مسجد پر برقعہ ڈال دیا ہے۔"

لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کروں۔ یہاں اور کوئی کیل ہی نہیں۔"

"اچھا اب سو جاؤ۔"

لڑکی نے گھڑی میز پر رکھدی اور خود بچھونے میں لیٹ کر لحاف اوپر کر لیا پھر
اس نے لحاف میں سے منہ باہر نکال کر کہا۔

"موم بتی بجھا دوں؟"

کبیر نے کہا

"اگر تمہیں اندھیرے پر اعتماد ہے تو بجھا دو۔"

"مجھے تم پر اعتماد ہے"۔

"ایسی غلطی پھر کبھی نہ کرنا۔"

چنانچہ موم بتی جلتی رہی۔ لڑکی کبیر کے بستر میں لیٹی رہی اور کبیر پرانی سی بوسیدہ آرام کرسی میں کمبل میں لپٹا دھنسا رہا۔ نیند کے حملے اب شدید ہو گئے تھے۔ کبیر کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ گرم کمبل میں آنے کے بعد نیند نے اس پر پوری طرح غلبہ پا لیا اور وہ سو گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ موم بتی آدھی جل چکی تھی۔ کمرے میں اس کی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی ہر شے ویسے ہی تھی جیسی ایک گھنٹہ پہلے تھی۔ لڑکی لحاف میں دبکی سو رہی تھی۔ ایک دو بار کبیر کو اس کے خرخرانے کی آواز سنائی دی۔ جس طرح بلی پیٹ بھر کر دودھ پینے کے بعد گرم گرم چولھے کے پاس لیٹ کر خرخراتی ہے' کبیر نے نیند پوری کر لی تھی۔ لڑکی کا ایک ہاتھ لحاف سے باہر تھا اور ہاتھ کی کلائی پر چھوٹی سی سنہری گھڑی بندھی تھی' کبیر نے قریب جا کر وقت دیکھا پونے چار بج رہے تھے۔ جب وہ وقت دیکھنے کے لئے لڑکی پر جھکا تو اس لحاف میں سے لڑکی کے ہلکے ہلکے سانس لینے کی آواز سنائی دی اور حنا کے عطر کی گہری گہری گرم خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ واپس آ کر اپنی کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اب اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب اسے نیند کی ضرورت بھی نہیں تھی۔
اب وہ یہ چاہتا تھا۔ کہ یہ لڑکی دن نکلنے سے پہلے ہی اس کمرے سے نو دو گیارہ ہو جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کبیر کے قرض خواہ صبح ہی صبح وہاں آن دھمکیں۔ لیکن لڑکی گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ کبیر اسے بیدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آج تک نہ تو کسی کو سونے کے لئے کہا تھا اور نہ اس نے کسی سوئے ہوئے کو جگایا تھا۔ وہ پریشان بھی نہ ہوا۔ اس نے سوچا اگر لڑکی سو رہی ہے تو سو رہے۔ قرض خواہ آ جائیں گے تو آ جائیں۔ اس نے جیبوں میں ہاتھ دے لئے اور چپ چاپ کرسی پر نیم دراز سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگا۔ جس پر لڑکی کا سیاہ برقعہ لٹکا ہوا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹہ وہ اس طرح آنکھیں کھولے' چپ چاپ' ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ دیوار پر سیاہ برقعہ بھی اسی طرح ساکت و جامد لٹکا رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بے حس و حرکت بیٹھے رہے اور ان کے درمیان وہ اجنبی لڑکی پڑی سوتی رہی۔ اچانک لڑکی نے پہلو بدلا۔ ایک گہرا سانس لیا۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو اس نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر کبیر پر پڑی۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ سو رہا ہے۔ مگر جب اس نے موم بتی کی دھیمی روشنی میں کبیر کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو حیران ہو کر بولی۔

"تم رات بھر جاگتے رہے کیا؟"

"نہیں"۔

"تمہیں میں نے بے آرام کیا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔"

"ہمیں یا تو ایسا کام ہی نہیں کرنا چاہئے جس کے بعد میں ہمیں افسوس ہو اور یا پھر کسی بھی ایسے کام پر افسوس کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ جو ہم کر چکے ہوں"۔

"پھر بھی میں تمہاری تکلیف کا باعث بنی ہوں۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

لڑکی چار پائی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے لحاف اپنے گرد لپیٹ لیا۔ پھر گھڑی دیکھ کر بولی۔

"پونے پانچ بجنے والے ہیں۔"

کبیر نے آہستہ سے کہا۔ جیسے اپنے آپ سے ہمکلام ہو۔

"ہاں ابھی کوئی دم میں صبح ہو جائے گی۔"

لڑکی نے کہا۔

"میں سورج نکلنے کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔"

کبیر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لڑکی بھی خاموش ہو گئی۔ کمرے میں لمبا سکوت طاری ہو گیا۔ اس خاموشی میں صرف اس چوہے کی کھڑ بڑ مخل ہو رہی تھی جو نالی میں سے روز احسان کے کمرے سے ادھر آ کر کبیر کی کتابوں کو کترا کرتا تھا۔ لڑکی نے آواز پر کان کھڑے کر کے کہا۔

"چوہا ہے کہیں"۔

کبیر نے کہا۔

"ہاں میرا دوست ہے کتابوں کا مطالعہ کرنے آجاتا ہے۔"

لڑکی ہنس پڑی۔ کبیر نے دوسری موم بتی جلا رکھی تھی۔ اس نے اس کی روشنی میں دیکھا۔

لڑکی کے دانت بڑے اجلے اور ہموار تھے۔ مسکراتے سے اس کے چہرے کا حلیہ بدل جاتا تھا۔ اور وہ کوئی دوسری لڑکی دکھائی دینے لگتی تھی۔ لڑکی نے کہا۔

"تم بڑے دلچسپ آدمی ہو۔ مجھے آج تک ایسا آدمی نہیں ملا۔"

"تم کتنے آدمیوں سے مل چکی ہو؟"

لڑکی کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں اور بولی۔

"چار آدمیوں سے۔۔۔ پہلا میرا باپ۔ دو میرے بھائی تھے، اور چوتھا میرا شوہر۔"

کبیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش بیٹھا دیا سلائی کان میں پھیرتا رہا۔ دیا سلائی کونے میں پھینک کر اس نے ہاتھ پھر کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیا۔ اور لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی کے بال رات بھر لیٹنے کی وجہ سے گھونسلا بن رہے تھے۔ لڑکی نے ہاتھ سے بالوں کو درست کیا اور بولی۔

"تم نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں کہ میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ اور رات کو کس طرح اکیلی گھر سے باہر نکل آئی؟"

کبیر نے کہا۔

"کیا اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں؟ آخر تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں گلی میں سے گزر رہا تھا کہ مجھے تم مل گئیں۔ تمہیں رات بسر کرنے کے لئے جگہ چاہئے تھی اور میرے پاس جگہ تھی۔ میرا فرض تھا کہ میں تمہیں پناہ دیتا۔"

"کیا مجھے آوارہ لڑکی سمجھ رہے ہو؟"

"میں نے تمہاری کوئی آوارگی نہیں دیکھی"

"جو لڑکی رات کو اکیلی......"

"میں ایسی لڑکی کو آوارہ نہیں سمجھتا"۔ کبیر نے اس لڑکی کی بات کاٹ کر کہا۔

وہ لڑکی خاموش ہو گئی۔ وہ حیران سی ہو رہی تھی کہ یہ کیا آدمی ہے۔ اس آدمی نے اس کے ساتھ کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کی جو ایسے موقعوں پر ایک عورت کو دیکھ کر اکثر مرد کر گزرا کرتے ہیں۔ اس لڑکی کو جہاں کبیر کی شرافت نفس کا قائل ہونا پڑا وہاں اسے اس کی بے نیازی میں اپنی توہین کا پہلو بھی دکھائی دیا۔ کبیر نے اسے اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا۔ کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا جیسا کہ عورتوں کے ساتھ ایسے حالات میں کیا جاتا ہے۔ اس لڑکی نے ہونٹ سکیڑ لئے اور ایک پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر آنکھیں کھول کر بولی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"کبیر"۔

"کب سے لاہور میں رہ رہے ہو؟"

"جب سے پاکستان بنا ہے۔"

"پہلے کہاں رہتے تھے؟"

"امرتسر میں"۔

"تمہارا دفتر کہاں ہے؟"

"سڑکوں پر"۔

لڑکی نے حیران ہو کر کبیر کی طرف دیکھا۔ پھر پوچھنے لگی۔

"تم کیا کام کرتے ہو؟"

"میں کوئی کام نہیں کرتا۔ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس دنیا کی تباہی اور بد نصیبی کا باعث صرف وہ لوگ ہیں جو کام کرتے ہیں۔ میں نے کام چھوڑ دیا ہے۔"

"تم کھاتے کہاں سے ہو؟"

کبیر نے مسکرا کر کہا۔

"کیا تم ایک ہی ملاقات میں سب کچھ معلوم کر لینا چاہتی ہو؟"

وہ لڑکی ہنس پڑی۔ ایک بار پھر اس کے سفید دانت نمایاں ہو گئے اور ایک بار پھر اس کا حلیہ بدل گیا۔ اور وہ دوسری لڑکی معلوم ہونے لگی۔ اس کے بعد اس نے خود ہی بتایا کہ اس کا نام زیتون ہے۔ اس کا باپ اور دونوں بڑے بھائی فسادات میں

قتل کر دیئے گئے تھے۔ وہ فیروز پور کی رہنے والی ہے۔ تقسیم کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ لاہور میں آ کر رہنے لگی۔ ماں کچھ روز بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اب وہ اس دنیا میں اکیلی تھی۔ اور رشتہ داروں کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ صبح سے شام تک ان کے گھر کا سارا کام کاج کرتی ۔ جھاڑو دیتی۔ برتن مانجھتی۔ آگ جلاتی۔ ان کے بچوں کی گندگی صاف کرتی ۔ کپڑے دھوتی ۔ کھانا پکاتی۔ بستر لگاتی۔ بڑی اماں کے پاؤں دابتی۔ جب وہ جوان ہو گئی تو رشتہ دار لڑکوں نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ دو ایک سے وہ بچ گئی۔ لیکن دو ایک کے وہ قابو آ گئی۔ وہ اپنی عصمت کو جان سے زیادہ پیاری چیز سمجھتی تھی۔ اسے بھی اپنی آبرو اسی طرح عزیز تھی، جس طرح ہر شریف زادی کو ہوتی ہے۔ مگر وہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بچ نہیں سکتی تھی۔ اور اسے حیرت تو اس بات پر تھی کہ خدا بھی اسے ان ہوسی درندوں سے نہ بچا سکا۔ جس رات پہلی بار مکان کی اوپر والی اندھیری کوٹھڑی میں اس کی عصمت لوٹی گئی تو اس کے سینے پر چاقوؤں کی نوک رکھ دی گئی تھی۔ اس رات کوئی طوفان نہ آیا۔ کہیں بھی بجلی نہ گری۔ کسی مندر سے کوئی دیوتا اور کوئی خدا بھاگ کر اس کی مدد کو نہ آیا۔ کسی معبد کا کلس نہ گرا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ آسمان پر تارے اسی طرح چمکتے رہے۔ پرندے باغوں میں چپ چاپ سوئے رہے۔ پھول اپنی ڈالیوں میں چھپے صبح ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ سب کچھ ویسے ہی رہا۔ جیسا کہ اس سے پہلے تھا۔ لیکن زیتون لڑکی سے عورت بن گئی۔ اب وہ ہر ہوس کار رشتے دار کی ہوس کا نشانہ بننے لگی۔ گھر والوں کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے مل کر زیتون کو خوب مارا۔ حرامزادی ہمارے بچوں کو خراب کرتی ہے۔ زیتون خاموشی سے مار کھاتی رہی اور زبان سے کچھ نہ بولی۔ وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ وہ تو ان عورتوں کے جوان بچوں کو خراب کر ہی چکی تھی اب کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن ان رشتہ دار عورتوں کے پاس ایک حل موجود تھا۔ انہوں نے دس پندرہ دنوں کے اندر اندر زیتون کی شادی کر ڈالی ۔ زیتون اپنے گھر چلی گئی۔ یہ شادی اس طرح ہوئی تھی۔ کہ زیتون کے خاوند نے ان عورتوں کو پانچ سو روپے نقد دیئے تھے۔ ایک ماہ تک زیتون اپنے گھر میں ٹھیک ٹھاک رہی۔ مگر ایک ماہ گذر جانے پر زیتون کے خاوند کو اپنے پانچ سو روپوں کا خیال ستانے لگا۔ اس کا خاوند کسی زمانے میں ایک لکڑ ہارا تھا۔ اس نے ترقی کر کے لکڑ ہارے کا کام چھوڑ دیا اور شہر میں آ کر ایک طوائف کے ہاں ملازم ہو گیا۔ یہاں سے ترقی کرنے کے بعد اس نے دو عورتیں اپنی خرید کر

رکھ لیں اور ان سے پیشہ کروانا شروع کر دیا۔ پھر اس نے ان عورتوں کو فروخت کر دیا اور خود شہر میں ایک جگہ چائے کا چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔ زیتون سے شادی کے بعد جب اس نے دیکھا کہ زیتون ابھی جوان ہے۔ اور خوش شکل بھی ہے۔ تو اس کی فطرت نے ایک بار پھر جوش مارا۔ طبیعت کی اصلیت ایک بار پھر سامنے آ گئی اور پھر اس نے زیتون پر پانچ صد روپیہ بھی خرچ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے حیدر آباد سندھ کے ایک بردہ فروش سے بات کر کے زیتون کو ایک ہزار میں فروخت کر دیا۔ اور خود ہوٹل کو خیرباد کہہ کر پشاور میں جا کر قلعی گری کا کام شروع کر دیا۔

زیتون کا نیا مالک اسے حیدر آباد سندھ لے گیا۔ یہاں اس نے زیتون سے پیشہ کروانا چاہا تو زیتون بڑی تلملائی۔ وہ ایسی زندگی ہرگز ہرگز اختیار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک شریف خاوند کی نیک بیوی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن حالات نے اس پر پاک باز زندگی کے تمام دروازے بند کر دیئے اور چاروں طرف سے بدکاری کے جنوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ بلکہ جب اس نے برائی کے سلسلے میں حالات کو پوری طرح ساز گار پایا اور نیک زندگی کے تمام امکانات کو مفقود دیکھا تو وہ یہ سمجھنے لگی کہ خدا کی رضا بھی شاید اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دے۔ زیتون نے شروع شروع میں بے حد احتجاج کیا مگر اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ نئے سندھی نے اسی بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اسے طرح طرح کی اذیتیں دیتا، اور مجبور کرتا کہ وہ برائی پر آمادہ ہو جائے۔ زیتون طرح طرح سے جتن کرتی کہ کسی طرح وہ اپنی باقی ماندہ عزت و آبرو کو محفوظ رکھ سکے۔ لیکن لکڑی کا چھوٹا سا پل سمندر کے طوفانی ریلوں کا کب تک مقابلہ کر سکتا ہے۔ آخر پل ٹوٹ گیا۔ اور طوفان کا پانی لکڑیوں کے ٹکڑوں کو بہا کر لے گیا۔

سندھی مالک نے زیتون سے پیشہ کروانا شروع کر دیا۔ زیتون کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ کوئی دو سال تک زیتون کا خون پینے کے بعد سندھی مالک نے لاہور کے ایک بردہ فروش کے پاس اسے ڈیڑھ ہزار میں فروخت کر دیا۔ زیتون اپنے نئے مالک کے ساتھ لاہور آ گئی۔ یہاں آ کر اسے شہر سے باہر ایک مکان میں بند کر دیا گیا۔ اس مکان میں ایک بار پھر گناہگار زندگی کا دور شروع ہو گیا۔ ایسی زندگی جس کے گڑھے میں زیتون دھکیل دی گئی تھی۔ لیکن آخر ایک دن زیتون کا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو گیا۔ ایک رات اپنے پہریداروں کو غافل

پا کر زیتون نے اپنے چند ایک کپڑوں کو سمیٹا اور اندھیری سرد اور سنسان رات میں اکیلی گھر سے باہر نکل آئی۔

"اس کے بعد مجھے تم مل گئے' میں نے تم سے رات بسر کرنے کی التجا کی اور تم مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔ بس یہ میری زندگی کی کہانی ہے' کیا اب تم مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہو یا نہیں؟"

کبیر کرسی پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ جب تک زیتون اپنی داستان سناتی رہی وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس کا جی دو ایک بار سگریٹ پینے کو چاہا مگر اس کی عادت تھی کہ وہ خالی معدے کبھی سگریٹ نہیں پیا کرتا تھا۔ رات کو بارہ بجے وہ سگریٹ پینا بند کر دیا کرتا۔ اور پھر چائے پینے سے پہلے کبھی سگریٹ نہ پیتا۔ وہ دوسری بعض عادتوں کی طرح اپنی اس عادت پر بھی پوری سختی سے کاربند تھا۔ چنانچہ اس خواہش کو بھی اس نے دبا دیا اور سگریٹ کی ڈبیا کو باہر نہ نکالا۔ جب زیتون نے اس سے پوچھا کہ کیا اب وہ اسے برا سمجھنے لگا ہے تو اس نے کہا۔

"میں کائنات کی ہر شے کا احترام کرتا ہوں۔ اور عورت کی سب سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔ میری نگاہوں میں تم بری نہیں ہو۔"

زیتون نے کہا

"میرا خیال تھا کہ رات کو تم میرے ساتھ ہی چارپائی پر سوؤ گے۔ اور اگر تم ایسا کرتے تو میں کوئی اعتراض نہ کرتی۔ مگر میں حیران ہوں کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔"

کبیر خاموش رہا۔ زیتون نے سر پر دوپٹے کو ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے کہا۔

"تم بڑے عجیب ہو۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تم نے اس پھل کو اٹھانے سے کیوں انکار کر دیا جو خود بخود تمہاری جھولی میں آن گرا تھا؟"

کبیر نے اونی ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"میں نے ایسے پھل کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا جو اپنے آپ میری جھولی میں آن گرے"۔

"کیا تم ڈالی سے پھل توڑ کر کھانے کے عادی ہو؟"

"نہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ ڈالی پر لگے ہوئے پھل کو میں محبت اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھ کر گزر جاتا ہوں۔"

"اور اگر وہ پکنے کے بعد زمین پر گر پڑے تو؟"

"تو میں اسے اٹھا کر اس کے مالک کے حوالے کر دیتا ہوں۔ گرے ہوئے پھل کی میں ڈالی پر لگے ہوئے پھل سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔"

"اور اگر اس کا کوئی مالک نہ ہو پھر کیا کرو گے؟"

"پھر میں اسے زمین کے حوالے کر دوں گا۔ زمین سب کی ماں ہے۔ دھرتی سب کی ماتا ہے۔"

زیتون کے چہرے پر تحیر تھا۔ وہ آنکھیں جھپکے بغیر کبیر کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اس قسم کی باتیں پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ یہ باتیں کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔ اور کچھ کچھ بالکل نہیں آ رہی تھیں۔ کبیر نے پوچھا۔

"تمہاری گھڑی کیا بجا رہی ہے؟"

زیتون نے اپنی کلائی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"ساڑھے پانچ بج رہے ہیں۔"

کبیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اب تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔"

"اتنی جلدی؟"

"ہاں ـــــ اگر تم ایک گھنٹہ اور بیٹھی رہیں تو ابھی کوئی نہ کوئی قرض خواہ آن دھمکے گا۔ اور میرا یہاں سے بچ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

زیتون نے حیرانی سے پوچھا

"کیا تم ناشتہ نہیں کرو گے؟"

"میرے پاس صرف تین آنے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں بازار میں جا کر چائے کی ایک پیالی پلا سکتا ہوں' اس کے علاوہ میں اگر چاہوں بھی تو تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا"۔

زیتون نے گردن جھکا لی' کبیر کرسی پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چھوٹے سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ زیتون کا خیال تھا کہ اس شخص کے پاس اسے پناہ مل جائے گی۔ یا اگر پناہ نہ بھی ملی تو کم از کم اتنا ضرور ہو گا کہ وہ ایک دو روز اس کے پاس رہ کر اپنی آئندہ بسر ہونے والی زندگی کے بارے میں کسی پروگرام کی تشکیل ہی کر سکے۔ لیکن یہ شخص تو اسے گھر سے ہی باہر نکال رہا تھا اگرچہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا اور خود بھی زیتون کے ساتھ دن بھر کے لئے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ پھر بھی زیتون کو بڑی

ناامیدی ہوئی۔ اس کے سامنے شہر درندوں سے بھرے ہوئے جنگل کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ جہاں سے اسے اکیلی گذرنا تھا۔ اس نے کبیر سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے کچھ روز کے لئے اس کمرے میں رہنے کی اجازت نہیں دو گے؟"

کبیر نے گردن جھکا کر کہا۔

"میرے پاس کچھ نہیں۔ تم ایسے کمرے میں بھوکی رہ لو گی۔ جہاں قرض واپس لینے والے بار بار تقاضہ کرنے آتے ہوں؟"

زیتون نے کہا۔

"میرے پاس کچھ زیوارت ہیں ۔ تم انہیں بازار میں بیچ دو۔ کچھ دنوں تک ہمارا گزارا ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر کچھ سوچ لیں گے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارا زیور بازار بیچنے جاؤں گا۔ تو دکاندار مجھ پر بھروسہ کر لے گا۔ اور پولیس کے حوالے نہیں کرے گا؟"

کبیر نے سرہلا کر آہستہ سے کہا۔

"نہیں نہیں مجھے یہ گوارا نہیں ۔ ابھی تمہارے پاس زیورات ہیں۔ ابھی تم ان کے سہارے جہاں چاہے رہ سکتی ہو۔ جب تمہارے پاس کچھ نہیں ہو گا تو بے شک میرے پاس آ جانا۔"

زیتون نے حیرت سے کہا۔

"کیا تم ایک بے سہارا عورت کو سہارا نہیں دو گے؟"

"حقیقت یہ ہے کہ میں کسی عورت کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ ویسے اس کمرے کا دروازہ ہر رات بارہ بجے کے بعد تم پر کھلا ہے۔ تم جس رات بھی چاہو بارہ بجے کے بعد یہاں آکر سو سکتی ہو۔ بارہ بجے سے پہلے آؤ گی تو یہاں تالا لگا ہو گا۔ کیونکہ بارہ بجے تک لوگ پیسوں کا تقاضہ کرنے آتے ہیں۔ اس کے بعد جانے کیا سوچ کر سو جاتے ہیں۔" جانے کیوں زیتون کو ہنسی آگئی۔ کبیر بھی مسکرایا اور ہاتھ مل کر بولا۔

"کیا کروں بس ایسے ہی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس طرز زندگی پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ لیکن اس سے چھٹکارا مشکل ہے اور پھر میں نے کبھی کوشش بھی تو نہیں کی۔ سوچتا ہوں کوشش کرنے سے کیا ہو گا۔ کوشش تو ایک بے کار فعل کا نام ہے۔ اگر اس کے ساتھ جعل ساز دماغ اور روپوں سے بھری ہوئی جیب نہ ہو۔"

"لیکن کم از کم تم اپنے قرض تو اتار سکتے ہو۔"

"قرض اتارنے کے لئے جو روپیہ چاہئے اور روپیہ پیدا کرنے کے بھی روپیہ چاہئے کیونکہ روپیہ بھی پانی کی طرح اپنی سطح ہموار رکھتا ہے اور صرف اسی کے پاس جاتا ہے جس کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

زیتون ایک پل کے لئے گہری سوچ میں کھو گئی۔ پھر وہ اٹھی۔ اس نے برقعہ پہنا۔ اپنی گٹھڑی اٹھائی اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ کبیر اس کے ساتھ دبے پاؤں آنگن میں سے گذر کر باہر گلی میں آ گیا۔ گلی میں صبح کی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ شاید دور شہر سے کہیں باہر مشرق میں سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مگر دبیز دھند کی تہہ اسے شہر والوں سے چھپائے ہوئے تھی۔ گلیوں سے باہر نکل کر کبیر بازار کی نکڑ پر آ کھڑا ہو گیا۔

(۲)

زیتون بھی کبیر کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس نے کالے برقعے میں اپنے آپ کو لپیٹ رکھا تھا اور سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ زیتون نے سوائے پوری آستینوں کے سویٹر کے اور کوئی بھی گرم کپڑا نہیں پہن رکھا تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے نیچی چھت والے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی اور ایک ایک مکھن بند کھایا۔ کیونکہ زیتون نے کبیر سے کہہ دیا تھا کہ اس کے پاس بٹوے میں کچھ روپے ہیں۔ ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر سڑک پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اب ادھر ادھر سڑکوں پر بے مقصد پھرتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ کبیر نے پوچھا۔

"اب تم کہاں جاؤ گی؟"

زیتون نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

"اس طرف۔"

"وہاں تمہارا کون ہے؟"

"ایک سہیلی رہتی ہے۔ اور تم کہاں جاؤ گے؟"

کبیر نے مشرق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس طرف جاؤں گا۔"

"اچھا تو۔۔۔۔۔"

"ہاں خدا حافظ"۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے جیسے ان کے قدم ایک دوسرے کی مخالف سمت کو نہ اٹھ رہے ہوں۔ جیسے وہ ایک مدت سے ایک دوسرے کے ساتھ چلے آ رہے ہوں۔ اور اب انہیں جدا ہونے کا بہت درد ہو۔ سڑک پر چاروں طرف ان کے اردگرد دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہوٹل کی بھٹی میں سرخ آگ دہک رہی تھی۔ سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی تانگہ گذر جاتا تھا۔ ایک بس جو کہ خالی تھی دھند میں گندے تیل کا سیاہ دھواں ملاتی ان کے قریب سے گذر گئی' اچانک دھند میں ڈوبی ہوئی ایبٹ روڈ کے آخر میں' شملہ پہاڑی کے عقب میں سے موسم سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی صبح کا سرخ گول سورج طلوع ہوا۔ اس کی لال لال روشنی نے راکھ' ایسے رنگ کی پھیکی دھند کو سرخ کر دیا۔ کبیر اور زیتون کے چہرے اور بھی سرخ ہو گئے۔ جدائی کی اس گھڑی میں سورج بھی ان کے ساتھ غمگین ہو گیا۔ لیکن اس غم کی جھلک کبیر کے چہرے پر کہیں بھی نہیں تھی۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح سنجیدہ' کچھ کچھ اداس اور طنز بھرا تھا۔ اس نے مسکرا کر زیتون کو خدا حافظ کہا اور شملہ پہاڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔ جدھر سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔

زیتون کچھ دیر سڑک کے کنارے کھڑی کبیر کو جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ سڑک پر پھیلی ہوئی دھند میں غائب ہو گیا تو زیتون نے نقاب چہرے پر گرایا۔ گٹھڑی کو اچھی طرح سنبھالا اور اپنی سہیلی کے گھر کی طرف چل پڑی۔ زیتون کی اس سہیلی کا نام شاہدہ تھا۔ اور وہ اس شہر سے باہر والی آبادی کے ایک مکان میں رہتی تھی۔ دو کمروں والے اس اک منزلہ مکان کا ایک آنگن بھی تھا۔ اس آنگن میں صرف گھاس اگی ہوئی تھی جو سردی کی مار کھا کر زرد ہو رہی تھی۔ جب زیتون بس میں سے اتر کر شاہدہ کے مکان کے دروازے میں داخل ہوئی تو آنگن میں گھاس شبنم سے بھری ہوئی تھی۔ شاہدہ کے دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ زیتون نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ کسی نے اندر سے دروازہ کھولا۔ یہ شاہدہ خود تھی۔ چھوٹا قد' بھرا بھرا بدن' کھلتا رنگ اور ماتھے پر ایک جانب زخم کا چھوٹا سا نشان۔ شاہدہ زیتون سے لپٹ گئی اور بڑی مسرت سے اسے اندر لے گئی۔ اندر جا کر زیتون نے اسے بتایا۔

"تم رات کو کہاں تھیں؟ میں کوئی آدھی رات کو تمہارے گھر آئی مگر دروازے

پر تالا دیکھ کر بڑی ناامید ہوئی۔"

شاہدہ نے زیتون کو صوفے پر بٹھا کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"میں ایک وکیل کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ بس کوئی ایک گھنٹہ ہوا واپس آئی ہوں مگر تم اتنی رات گئے کہاں پھرتی رہی تھیں؟ کیا تم وہاں سے بھاگ آئی ہو؟"

شاہدہ نے سلگتی ہوئی انگیٹھی زیتون کے آگے کر دی تھی۔ زیتون انگیٹھی پر ہاتھ پھیلائے رات بھر کی کھائی ہوئی سردی زائل کر رہی تھی۔ اس نے نفرت سے کہا۔

"ہاں بھاگ آئی ہوں۔"

شاہدہ نے زیتون کے لئے چائے کا پیالہ بنا کر کہا۔

"تم نے اچھا کیا جو اس ظالم کے پنجے سے نکل آئیں۔ اب وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

زیتون نے اداس ہو کر کہا۔

"لیکن میرا کوئی گھر نہیں ہے شاہدہ۔ میں اگر اسی طرح سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہی تو ایک نہ ایک دن وہ ظالم مجھے اپنے جال میں پھانس لے گا۔"

شاہدہ نے زیتون کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو زیتون! کیا میں تمہاری سہیلی نہیں ہوں؟ یہ گھر میرا ہی نہیں تمہارا بھی ہے۔ اس پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ میرا ہے۔ تم بڑے اطمینان سے یہاں رہ سکتی ہو۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گی۔ تمہاری قسمت تمہارے ساتھ ہے اور میری قسمت میرے ساتھ۔ اور پھر میں بھی تنہائی محسوس نہیں کروں گی' دو کمرے ہیں' ایک کمرے میں تم رہ لینا۔"

زیتون نے شاہدہ کا محبت سے ہاتھ دبا دیا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ شاہدہ! تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے مگر میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ چاہتی ہوں کسی سے دو کلمے پڑھوا لوں اور شریفانہ زندگی بسر کروں۔"

شاہدہ نے سر جھکا لیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ سر اٹھا کر کہنے لگی۔

"ہمارے ساتھ اب کون شادی کرے گا؟ ہم شادی کی منزل کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہیں زیتون! کوئی بھی مرد یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ کسی ایسی عورت سے شادی کرے

جس کو شہر میں ہر چوتھا شخص جانتا ہو اور جس کے گھر پر عصمت کا نیلام شہر کے ہر چوک میں اٹھا ہو۔ نہیں نہیں زیتون! شادی کے بعد ہماری زندگی اس سے بھی زیادہ گھناؤنی اور تلخ ہو جائے گی۔ خاوند کے طعنے ہمیں چین کا ایک دن بھی نہیں گذارنے دیں گے۔"

زیتون نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو شاہدہ! اس کے باوجود تم اس زندگی کی برائی اور شادی شدہ زندگی کی اچھائی کو نظرانداز نہیں کر سکتیں۔ یہ زندگی ہر حالت میں بری زندگی ہے اور اس کا انجام اس بھی زیادہ خوفناک ہے ذرا سوچو جب ہماری جوانی ڈھل جائے گی۔ جب ہمارے جسم میں گداز اور تناؤ باقی نہیں رہے گا تو ہمارا کیا حشر ہو گا؟ پھر ہمیں کون منہ لگائے گا۔ یہی لوگ جو ایک رات کا ہمیں سو روپیہ دے کر ہماری ہڈیاں تک چبا ڈالتے ہیں پھر ہماری طرف منہ کر کے تھوکنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔"

شاہدہ نے سگریٹ کا کش لگا کر اسے انگیٹھی میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم کیا کر سکتی ہیں۔ اگر انجام یہی لکھا ہے تو ہم قدرت کے لکھے ہوئے کو مٹا نہیں سکتیں۔ اور پھر میں اس زندگی کو اتنا برا نہیں سمجھتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم ان عورتوں سے ہزار درجے بہتر ہیں جو خاوند کو دفتر بھجوا کر خود غیرمردوں کے ساتھ سینما گھر میں بیٹھ کر چوما چاٹی کرتی ہیں۔ ہم اپنے پیار کی قیمت لیتی ہیں۔ اور اپنا آپ پوری طرح گاہک کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ہم کسی سے فریب نہیں کرتیں۔ دھوکا نہیں دیتیں۔ گاہک کہتا ہے سگریٹ پیو' ہم سگریٹ پی لیتی ہیں۔ وہ کہتا ہے شراب پیو' ہم تھوڑی بہت شراب بھی پی لیتی ہیں۔ وہ کہتا ہے مجھے پیار کرو' اور ہم اسے پیار کرنے لگتی ہیں۔ خواہ اس کے جسم پر خارش نکلی ہوئی ہو۔ اور خواہ پھلبہری کے داغ ہوں۔ ہم پیدا ہی ایسی نہیں ہوئیں۔ ہم دونوں شریف ماں باپ کی بیٹیاں ہیں۔ تمہیں یاد ہے ناں' فیروزپور میں ہم مولوی صاحب سے سیپارہ پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ دوپہر کو آٹا لے کر تنور پر روٹیاں لگوانے جایا کرتی تھیں۔ مزار پر موم بتیاں جلایا کرتی تھیں۔ لیکن حالات بدل گئے۔ اور ہم اس گناہ کی زندگی پر مجبور کر دی گئیں۔ ہمیں ان مردوں نے اپنی عیاشی کی خاطر شہوت کے ان گڑھوں میں پھینکا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اب اگر آخری عمر میں ہمیں کوئی نہ پوچھے گا تو نہ پوچھے۔ جب آخری عمر آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ کیا خبر ہم جوانی میں ہی مرجائیں۔ بڑھاپے تک

نوبت ہی نہ پہنچے۔ تم ان باتوں کو چھوڑو اور چائے پیو اور بناؤں چائے؟"

"ہاں ایک پیالی اور بنا دو۔"

زیتون سر جھکا کر بڑی خاموشی اور توجہ سے شاہدہ کی باتیں سن رہی تھی' شاہدہ اس کی بڑی پرانی اور بچپن کی سہیلی تھی۔ فیروزپور میں اس کا مکان زیتون کے مکان کے پاس ہی واقع تھا۔ دونوں محلے میں اکٹھے کھیلا کرتی تھیں۔ مولوی صاحب سے قرآن بھی انہوں نے مسجد میں اکٹھا ہی پڑھا۔ وہ ایک ساتھ بڑی ہوئیں اور کمیٹی کے پرائمری سکول میں پڑھنے بیٹھ گئیں۔ ان دونوں کے باپ کیا کرتے تھے۔ یہ بتانے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک پیشہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بس وہ بیچارے محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال رہے تھے۔ ان ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی طرح جو اس براعظم میں صرف اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر ہی زندہ ہیں۔ جنہیں روٹی کمانے سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ کچھ اور بھی سوچ سکیں۔ اور قدرت کے مظاہر پر غور و فکر بھی کر سکیں۔ ان کے نزدیک قدرت ایک بہت بڑا کولہو ہے۔ جس کے آگے وہ جتے ہوئے بیل ہیں ----- مجبور اور بے بس! وہ پیدا ہوتے ہیں۔ تو جوا ان کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے اور جب مرتے ہیں تو اتار دیا جاتا ہے۔ اور ان کے بچوں کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

فیروزپور میں ہی شاہدہ کے ماں باپ مرگئے۔ اور وہ اپنے چچا کے پاس چلی گئی۔ وہ ابھی چھوٹی ہی تھی۔ اس کے چچا کے پاس زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ جس پر اس کی گذر بسر ہو رہی تھی۔ فسادات شروع ہوئے تو زمین سے آمدنی بند ہو گئی۔ چچا ایک روز چھپ چھپا کر اپنی زمین پر گیہوں لانے گیا اور وہیں قتل ہو گیا۔ شاہدہ کو اس کا چچا زاد بھائی اپنے ساتھ پاکستان لے آیا۔ یہاں وہ اسے اپنی ایک دور کی رشتہ دار کے پاس چھوڑ کر خود کویت چلا گیا۔ اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔ رشتہ دار عورت کے ہاں شاہدہ جوان ہو گئی۔ تو سب سے پہلے گھر کے مردوں نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ ان سے بچنے کے لئے وہ محلے کے ایک نوجوان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ پھر اس نوجوان سے بچنے کے لئے وہ ایک دوسرے آدمی کے ساتھ فرار ہو گئی اور اس طرح ہر آدمی سے بچتی' ہر آدمی کے ہتھے چڑھتی شاہدہ دربدر پھرنے لگی اور جگہ جگہ اپنی آبرو لٹواتی ایک وکیل کے پاس آ کر رک گئی۔ وکیل نے اسے ایک الگ مکان لے کر دے

دیا اور مکان کے کرائے کے علاوہ اسے ہر ماہ تین سو روپے دینے لگا۔ وکیل کبھی خود اس کے پاس آ جاتا اور کبھی اسے اپنے ہاں بلوا لیا کرتا۔ شاہدہ دو سال سے اسی وکیل کی داشتہ بن کر رہ رہی تھی۔ اس وکیل کے چھ بچے تھے اور بیوی بقید حیات تھی۔ لیکن اس کی کمائی بچوں کے اخراجات سے زیادہ تھی۔ یعنی اتنی زیادہ تھی کہ وہ آسانی سے ایک داشتہ کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے شاہدہ کو داشتہ بنا لیا۔ شاہدہ کو وکیل نے اتنی اجازت دی رکھی تھی کہ وہ کبھی کبھی کسی دوسرے مرد کے ساتھ رات بسر کر سکتی ہے اور اس کے عوض ہر ماہ شاہدہ کی تنخواہ میں سے پچاس روپے کاٹ لیتا تھا۔ یعنی اس طرح شاہدہ کو دو سو پچاس روپے مل رہے تھے۔ لیکن شاہدہ لک چھپ کر شکار پھانس لیتی اور اس سے زیادہ کما لیا کرتی۔ اس نے زیتون کو مشورہ دیا۔

"تم اگر چاہو تو میں تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملوا دوں گی جو تمہیں یہاں بیٹھے بیٹھے ہر ماہ دو سو روپے دے دیا کرے گا اور تم کو اپنا کام کرنے کی بھی اجازت ہو گی۔ تمہیں صرف ہفتے میں ایک دو بار اس شخص کے پاس جا کر رات بسر کرنا ہو گی۔ وہ بڑا امیر آدمی ہے۔ اس کا کارخانہ ہے۔"

زیتون نے سر ہلایا۔

"نہیں شاہدہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں ایک شریف عورت بن کر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں اس زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔"

شاہدہ نے دوسرا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ شریفانہ زندگی اب ہمارے بس میں نہیں رہی۔ ہم اگر دس بار بھی حج کر آئیں تو لوگ ہمیں رنڈی ہی کہیں گے۔ بھلا بتاؤ تم کیا کرو گی؟"

"میں کسی دستکاری کے سکول میں داخل ہو جاؤں گی اور سینا پرونا کر کے اپنا پیٹ پالوں گی۔"

شاہدہ خاموش ہو گئی اور انگیٹھی میں جلتے ہوئے کوئلوں کو تکنے لگی۔ نوکرانی اندر آ کر چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ شاہدہ نے اسے نہانے کے لئے پانی گرم کرنے کو کہا۔ پھر سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولی۔

"اچھا ہے۔ تم یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ میں کوئی زبردستی تمہیں اپنی دنیا میں نہیں لانا چاہتی اور پھر اس دنیا کے نشیب و فراز سے تم واقف ہو۔ اگر دستکاری سیکھ کر تم

شادی کر لو گی۔ تو پھر کیا ہو گا۔ ایک آدمی تمہارا مالک ہو گا۔ وہ جب اور جس وقت چاہے تمہاری ہڈیوں کو جھنجھوڑ سکے گا اور وہ تمہارے ماضی کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہاں تو ہم اپنی مرضی سے کسی آدمی کو چن لیتی ہیں اور پھر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے اس سے شادی کر لیتی ہیں اور اپنی عزت کا معاوضہ لے کر اسے چلتا کرتی ہیں۔"

زیتون نے کہا۔

"لیکن تمہیں اس دنیا میں ایک بھی آدمی اپنی بیوی، اپنی بھابھی، یا اپنی بہن کہنے پر راضی نہیں ہو گا۔ کوئی بچہ ایسا نہیں جو تمہیں اپنی ماں کہہ کر پکار سکے۔ شاہدہ! کبھی تم نے اس طرح بھی سوچا ہے؟"

شاہدہ کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ سگریٹ کو انگلیوں میں گھمانے لگی۔ اس کے ناخنوں کا نیل پالش کئی جگہوں سے جھڑ چکا تھا اور نیچے سے سفید ناخن نظر آ رہے تھے۔

"ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے میرا کوئی بھائی زندہ نہیں رہا، ماں بننے کے میں قابل نہیں رہی۔ مجھے حمل ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ ایک ڈاکٹرنی نے مجھے بتا دیا تھا۔ اور بیوی بنانے پر کوئی تیار نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟ کیا بھوکوں مروں؟"

"تم میرے ساتھ چل کر دستکاری والے سکول میں داخل کیوں نہیں ہو جاتیں۔ ہم دونوں وہاں مل کر کام کر سکیں گی۔ اور اچھی زندگی بسر کریں گی۔"

شاہدہ نے ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہا۔

"میں اتنی ست اور آرام پسند ہو گئی ہوں کہ اب سوائے داشتہ بن کر پڑی رہنے کے اور کوئی کام بھی نہیں کر سکتی۔ آدمی جس ماحول میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماحول کا اچھا برا اثر اس پر ضرور پڑتا ہے۔ مجھے میرے اس ماحول نے مجھے اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ اور اب تو میری حالت اس پرندے کی سی ہو گئی ہے جو گھر والوں سے مانوس ہو گیا ہو اور پنجرے سے باہر نکل کر بھی اڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔ میں چاہوں بھی تو اس ماحول سے چھٹکارا نہیں پا سکتی اور میں تو یہاں سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتی۔"

زیتون نے گردن اٹھا کر کہا۔

"لیکن میں اس ماحول سے ضرور نجات حاصل کروں گی۔"

"اگر تم یہ فیصلہ کر چکی ہو تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔"

زیتون نے شاہدہ کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکنے لگے۔ اب اسے اپنی منزل بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اسے کبیر کا خیال آ گیا۔ اس نے ایک پل کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اس نے گھڑی پل کے لئے کبیر کو اپنی پلکوں میں چھپا لیا ہو۔ شاہدہ غسل کرنے کے لئے غسل خانے میں چلی گئی کیونکہ نوکرانی نے پانی گرم کر کے اندر رکھ دیا تھا۔ زیتون نے میز پر رکھا ہوا ایک فلمی رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اس کی نگاہیں رسالے کی تصویروں پر جمی تھیں اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے رہنے کے لئے بسیرا مل گیا تھا۔ اب وہ بڑی آسانی سے ایسے سکول کا کھوج لگا سکتی تھی جہاں لڑکیوں کو دستکاری سکھائی جاتی ہو۔

دن نکل آیا تھا۔ دھوپ چمکنے لگی تھی۔ شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں سے دھند غائب ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں سے نکل کر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اور روز کی طرح بسوں میں بیٹھ کر' تانگوں' کاروں' ریل گاڑیوں اور سائیکلوں پر سوار ہو کر شور مچاتے' باتیں کرتے' پٹرول اور جلے ہوئے تیل کی بو چھوڑتے' گرد اڑاتے' سڑکیں توڑتے' فٹ پاتھوں کو اپنے جوتوں سے لتاڑتے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کام' کام' کام۔۔۔۔ دفتروں میں' دکانوں میں' سکولوں میں' گھروں میں' ہر جگہ کام ہو رہا تھا۔ کارخانوں میں مشینیں چل رہی تھیں۔ مال ریڑوں پر لاد لاد کر سٹیشن پر پہنچایا جا رہا تھا۔ اجناس کی منڈیوں میں گندی مندی' ملاوٹی' اصلی نقلی اشیاء کی خرید و فروخت ہو رہی تھی' پائی پائی کا حساب ہو رہا تھا۔ کوئی جیب بچا رہا تھا اور کوئی اسے مختلف طریقوں سے کاٹنے کی فکر میں پینترے بدل رہا تھا۔ کچہریوں میں موکل وکیلوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ منشی انہیں رام کر رہے تھے۔ اشٹام بیچنے والوں کے کھوکھوں کے باہر پریشان حال لوگوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ کچہریوں کے اندر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے وکیل زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ اور ملزم کٹہروں میں کھڑے سہمی ہوئی نظروں سے کبھی وکیل کا منہ اور کبھی انصاف کرنے والے کا منہ تک رہے تھے۔ کیا جب آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا تو اس پر مقدمہ چلا تھا؟ کسی نے وکالت کی تھی؟ کسی منشی نے منشیانہ لیا تھا؟ اشٹام فروخت ہوئے تھے؟ گواہوں نے رشوت لی تھی؟۔۔۔۔۔

کبیر ایبٹ روڈ سے ہو کر' ایمپرس روڈ پر سے ہوتا ہوا ریلوے سٹیشن کا پل عبور

کر کے فیض باغ کی آبادی میں سے گذر رہا تھا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی گندی نالیاں تھیں اور شورہ زدہ نم دار ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں والے بھنگیے ٹیڑھے مکان تھے جن کی پہلی منزلوں کے فرش سیلابوں کی وجہ سے پچکے ہوئے تھے۔ گندے نالے کا پل عبور کر کے کبیر کھیتوں کے ساتھ ہوتا دسن پورے کی جانب چل پڑا۔ ان کھیتوں میں سرسوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں گندے نالے اور مویشیوں کے گوبر کی بدبو پھیلی ہوئی تھی' ایک گائے مسجد کے پاس بندھی ہوئی تھی اور ڈکرا رہی تھی۔ کچھ لڑکے کھیت میں کھڑے پتنگ اڑا کر پیچ لڑا رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ فضا میں بے شمار مکھیاں چکر لگا رہی تھیں۔ کبیر جب دسن پورے والی سڑک پر آیا تو کوڑے اور گندگی سے لدا ہوا گڈا رینگتا ہوا شادباغ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اندرون شہر کی یہ سب سے بڑی برآمد تھی۔ جو شادباغ کے کھیتوں کو عطا ہوتی تھی۔

گڈا جس سڑک پر سے گذرتا وہاں کی مکھیاں اس کے ساتھ ہو لیتیں۔ بھنگنیں بھاگ کر آتیں اور گندگی سے بھری ہوئی کڑاہیاں اور ٹوکریاں گڈے میں پھینک دیتیں۔ گڈا چلانے والا بھنگی کالے رنگ کا تھا۔ اور وہ گرد میں اٹا ہوا تھا۔ پتلی پتلی کالی ٹانگیں پھٹی ہوئی دھوتی میں سے نظر آ رہی تھیں۔ بوسیدہ کھیس میں لپٹا وہ گڈے پر اکڑوں بیٹھا چھوٹا سا بدوضع حقہ پی رہا تھا۔ بیلوں کے گردنوں پر زخم ہو رہے تھے اور چربی نکل آئی تھی۔ وہ جوں کی چال چل رہے تھے۔ اس کے باوجود انہیں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ اور ان کے پھولے ہوئے نتھنوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ وہ زمین پر کھر رکھ کر اسے پوری طاقت سے پیچھے دھکیلتے۔ جہاں ان بیلوں کے کھر پڑتے وہاں سے سڑک چھل جاتی۔

کبیر کچھ دیر تک اس گڈے کے یا گڈا کچھ دور تک کبیر کے ساتھ ساتھ گیا۔ دسن پورے کے دوسرے بڑے چوک میں جا کر کبیر نے ایک گنا خریدا اور اسے چوستا ہوا شادباغ کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایک دیو ہیکل بس کھڑکھڑ کرتی' جھومتی جھامتی گرد کے بادل اڑاتی آئی اور تیزی کے ساتھ کبیر کے اوپر گرد ڈالتی گذر گئی۔ کبیر بدستور گنا چوستا رہا۔ اور شادباغ جانے والی سڑک پر چلتا رہا۔ ایک جگہ بھٹی گرم تھی اور بھڑبھونجی دانے بھون رہی تھی۔ بھنے ہوئے دانوں کی سوندھی مہک کبیر کے دل و دماغ کو تازہ کر گئی۔ بھڑبھونجی بھی کوئی اتنی بری نہیں تھی' گہرا سانولا رنگ' میل میں جمے ہوئے بال' بوسیدہ کپڑے' بھرے بھرے گال۔۔۔۔ ونڈرفل! کبیر جانوروں کی طرح

گنا چوس رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کا اور اس دنیا کا آخری گنا چوس رہا ہے۔ بھٹیارن کے دونوں کالے بھجنگ لڑکے اپنی کالی کالی آنکھیں کھولے کبیر کو گنا چوستے دیکھنے لگے۔ کبیر نے آدھا گنا ان بچوں میں بانٹ دیا۔ بچے پہلے تو شرمائے اور لے کر خوشی خوشی اپنی ماں کے تنور کی جانب بھاگ گئے۔ اب سامنے سے ایک بس کھڑکھڑاتی آ رہی تھی۔ یہ بس بھی کبیر پر سڑک کی مٹی ڈال کر گذر گئی۔ اور وہ بڑے مزے سے گنا چوستا رہا۔

شادباغ پہنچ کر اس نے ایک کوارٹر نما مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہاں کبیر کا دوست اپنی بیوی اور چار عدد بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کاتب تھا اور اس کا نام علی احمد تھا۔ علی احمد کوئی چھ سات برس سے اس کا دوست تھا۔ کبیر کبھی کبھی اس سے ملنے اس کے ہاں چلا جایا کرتا تھا۔ ویسے تو علی احمد کاتب تھا لیکن اسے گانے بجانے کا بھی شوق تھا۔ اور اس کی آواز بھی اتنی بری نہیں تھی۔ وہ اسے گھر پر ہی مل گیا۔ کبیر اس کی بیٹھک میں آ کر تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ علی احمد کتابت کر رہا تھا۔

"کہو کیا حال ہے کبیر جی؟"

"اچھا حال ہے۔ یہ کیا لکھ رہے ہو؟"

علی احمد نے قلم کا نب کپڑے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"بڑا گرم ناول کتابت کر رہا ہوں۔"

اور پھر خود ہی مسکرانے لگا۔

کبیر مسودے میں سے کچھ کاغذ لے کر پڑھنے لگا۔ تحریر بڑی سستی اور گھٹیا تھی اور جگہ جگہ جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے جملوں سے کام لیا گیا تھا۔ مکالمے بھی بڑے فحش اور لچر تھے۔ کبیر نے مسودہ تخت پوش پر رکھ دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ علی احمد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں پسند آیا؟"

کبیر نے کہا۔

"بہت"۔

کبیر خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا اور علی احمد خاموشی سے کتابت کرتا رہا۔ علی احمد کی بیوی نے اندر سے چائے بنا کر بھیج دی۔ چائے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ جن کا کبیر یا علی احمد کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چائے

کے بعد علی احمد نے ہارمونیم کی پیٹی تخت پوش کے نیچے سے نکالی اور اسے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"کیا سنو گے کبیر جی؟"

"جو دل میں آئے سنا دو۔"

علی احمد اثبات میں سر ہلا کر ہارمونیم بجانے لگا۔ ہارمونیم کی آواز دوسرے کمرے میں پہنچی تو علی احمد کی بیوی اپنا غصہ پی کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کا خاوند کام نہ کر سکے گا۔ علی احمد کچھ دیر ہارمونیم کو سر کرتا رہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد رک جاتا۔ اور پردہ اٹھا کر لکڑی کی سروں والی ٹکڑیوں کو انگلی سے ٹھونکنے بجانے لگتا۔ جب باجہ اس کے خیال میں پوری طرح سر میں ہو گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے پوری ہوا دے کر دائیں ہاتھ کی انگلیاں تیزی سے سروں پر دوڑائیں اور پھر دھیمے سے سر اٹھا کر غزل گانے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ گا رہا تھا۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
نہ پھول تھے نہ چمن تھے نہ آشیانہ تھا

غزل ختم کر کے علی احمد نے کاغذوں کا پلندہ سا اپنے گھٹنے پر رکھا اور انہماک سے ایک بار پھر کتابت شروع کر دی۔ جیسے وہ اپنی پیدائش کے وقت سے وہاں بیٹھا کتابت کر رہا ہو۔ کبیر نے سگریٹ پاؤں تلے مسلا۔ اور علی احمد کو سلام کر کے باہر نکل آیا۔

باہر دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ آسمان گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ دھوپ کی گرمائش نے سردی کی شدت کو بہت جلد زائل کر دیا تھا۔ شادباغ کی کوٹھیوں اور سڑک کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے درختوں پر دھوپ خوب نکھری ہوئی تھی۔ پان سگریٹ والوں کی دکانوں اور ایک ہوٹل میں ویڈیو پر فلمی گانے ہو رہے تھے۔ کبیر کوٹھیوں کی ایک عقبی گلی میں سے ہو کر باہر کھیتوں میں نکل آیا۔ یہاں ترکاریوں، چارے اور سرسوں کے کھیت تھے۔ دو ایک جگہوں پر رہٹ چل رہے تھے، اور شفاف پانی باولی میں سے گر رہا تھا۔ کماد کے کھیتوں میں اونچے اونچے گنے لگے ہوئے تھے۔ ایک کھیت میں کسان ہل چلا رہا تھا۔ ایک کھیت میں جگہ جگہ گھاس کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی ہوئیں تھیں اور ان پر چیل کوے جھپٹ رہے تھے۔ رہٹ کی باولی پر دو کسان بیٹھے مٹی میں ستی ہوئی

مولیوں کو دھو دھو کر ٹوکرے میں ڈال رہے تھے۔ مولیاں لمبی لمبی اور مخروطی تھیں، اوپر سے سفید اور نیچے سے سبز۔۔۔۔۔ یقیناً یہ میٹھی ہوں گی۔ جہاں ٹیوب ویل لگا تھا وہاں لوہے کی ایک نالی میں سے پانی کی ایک موٹی دھارچہ بچے میں گر رہی تھی۔ ایک آدمی لنگوٹا باندھے جھک کر نہا رہا تھا۔ دوسرا آدمی چبوترے پر بیٹھا گنا چوس رہا تھا۔ دور پیپل کے درخت تلے ایک الاؤ میں سے دھواں اٹھ اٹھ کر فضا میں پھیل رہا تھا۔ ٹیوب ویل کا پانی جس نالے میں سے ہو کر کھیتوں میں جا رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ گیندے کے پودے لگے تھے۔ یہ پودے کیسری اور نیبو ایسے بسنتی رنگ کے گیندے کے پھولوں سے لدے پھندے تھے۔ کبیر ان پھولوں کو دیکھتا ہوا آگے گذر گیا۔ اس کا پاؤں ایک جگہ پھسلا اور اس کے پاؤں پر تھوڑا سا کیچڑ لگ گیا۔ کبیر ایک چھوٹی سی کھیتی کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔ یہ کھیتی سچے گلاب کے پھولوں کی تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ ساتھ اب پھولوں میں بھی ملاوٹ ہونے لگی تھی۔ گلاب کے پھول اس ملاوٹ کا زیادہ شکار ہوئے تھے۔ ان کی تو شکل ہی بدل گئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ چوڑے اور خوش رنگ ہو گئے تھے۔ لیکن ان میں خوشبو مفقود ہو گئی تھی۔ یا اگر خوشبو آتی بھی تھی تو اتنی تیز گویا اس کی پتیوں پر عطر مل دیا گیا ہو۔ مگر اس کھیتی میں اصلی اور سچے گلاب کے پھول کھل رہے تھے۔ پیازی رنگ کے پوری کھلی ہوئی پنکھڑیوں والے پھول۔ جن سے بھینی بھینی شیریں مہک اٹھ رہی تھی۔ ان پھولوں پر بھنورے منڈلا رہے تھے۔ اس کھیتی کے گرد خاردار جھاڑیوں کی باڑ لگا دی گئی تھی، کیونکہ یہ پھول گلقند بنانے کے کام آتے تھے۔

کبیر کتنی ہی دیر اس کھیتی کے پاس کھڑا گلاب کے پھولوں کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنے قلب میں گہرے سکون اور اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھی گلاب کا ایک پودا ہے۔ اسے اپنے جسم پر کانٹوں، پتیوں، پھول کی پنکھڑیوں، شبنم، مکڑی کے جالوں اور گلاب کی گہری گہری خوشبو کی اٹھتی ہوئی لہروں کا احساس ہوا۔ تین عورتیں ٹوکریاں اٹھائے کھیت میں داخل ہوئیں اور پھول چننے لگیں۔ جب شام کو یہ سارے پھول چن لیں گی تو ان کے کپڑوں اور ہتھیلیوں سے گلاب کی خوشبو آ رہی ہو گی!

ایک عورت نے کبیر کو دیکھا اور پھر ذرا مسکرا کر دوسری عورت سے بات کرنے لگی کبیر وہاں سے ہٹ گیا اور کھیتوں کھیت ہو کر واپس روانہ ہو گیا۔ کچھ گائیں

اور بھینسیں کماد کے کھیت کے ساتھ کھڑیں شلغم اور گوبھی کے موٹے موٹے ڈنٹھل کھا رہی تھیں۔ کبیر جب وہاں سے گذرا تو ایک بھینس نے منہ میں بڑا سا شلغم چباتے ہوئے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کبیر ذرا سا مسکرایا اور اس نے یوں منہ بنایا جیسے بھینس کا بوسہ لے رہا ہو۔ بھینس بھی مسکرائی ہو گی اور شرما گئی ہو گی۔ لیکن بھینس کی مسکراہٹ اور شرمیلے پن کو دیکھنے کے لئے انسان کے اندر بھینسے کا ہونا ضروری ہے۔ اور کبیر نے اس شرم کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ ایک گڈا کبیر کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اس پر گاجریں لدی ہوئی تھیں۔ کبیر جب اس کے پاس سے گذرنے لگا تو اس نے بڑی بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا کر چھ سات گاجریں اٹھا کر اوور کوٹ کی جیب میں بھر لیں اور ایک گاجر کو دانتوں سے توڑ کر بڑے مزے سے کھاتا آگے چل دیا۔ گاجر میٹھی تھی۔ کبیر نے چھابڑی والے سے خرید کر بھی گاجریں کھائی تھیں۔ مگر اسے اتنا مزہ کبھی نہیں آیا تھا۔ وسن پورے سے نکلتے نکلتے اس نے ساری گاجریں ختم کر لیں۔ مصری شاہ کے پل کے نیچے سے نکل کر کبیر نے بس پکڑی اور رائل پارک میں آ گیا۔ رائل پارک کے ہوٹلوں میں فلمی لوگ بیٹھے گرما گرم باتیں کر رہے تھے۔ کہیں ہیرو بننے کا شوقین چہرے کے تاثرات سے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہیں کوئی فلم بنانے کی دھن میں فنانسر کو اپنی باتوں کے چکر میں پھانسنے کی فکر میں تھا۔ ان ہوٹلوں میں عام طور پر ایسے فنانسر آتے تھے جن کی جیبیں خالی مگر زبان وعدوں سے لبریز ہوتی تھی۔ ایسے فلمی متوالے آتے جو محض اس امید میں سٹوڈیوز کے چکر کاٹ رہے تھے کہ ایک نہ ایک روز انہیں ضرور ہیرو بننے کا چانس مل جائے گا۔

کبیر ایک عمارت کی تیسری منزل پر ایک تنگ سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس کا ایک فلمی دوست جو کہ فلمی شاعر تھا دیسی شراب کا ادھا سامنے رکھے ایک فلم کے گیت لکھنے میں مصروف تھا۔ کبیر کو اندر آتا دیکھ کر اس نے ایک نعرہ لگایا۔

"اگر تم دو منٹ بعد آتے تو میں نے گیت مکمل کر لیا ہوتا۔"

کبیر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ہمیشہ دو منٹ پہلے آتا ہوں۔"

"تم کمینے ہو۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"شراب پیو گے؟"

"ضرور"۔

فلمی شاعر نے اپنا گلاس خالی کر کے کبیر کو شراب کا ایک پیگ بنا کر دیا۔ کبیر نے ایک ہی گھونٹ میں ساری شراب چڑھالی۔

"کمینے کیا شیر مادر سمجھ کر پی گئے ہو۔"

کبیر نے کوٹ کی آستین سے ہونٹ پونچھے اور فلمی شاعر کا سگریٹ سلگا لیا۔

"ظاہر ہے تم سے یہ پوچھنا بے کار ہے کہ کہاں سے آ رہے ہو اور یہاں کس لئے آئے ہو کیونکہ تم یقیناً آوارہ گردی کر کے آ رہے ہو۔ اور یہاں محض میرا سر کھانے اور میری شراب اور سگریٹ تباہ کرنے آئے ہو۔ بہرحال اب سنو! میرے گیت کا مکھڑا سنو۔"

کبیر نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"سناؤ"۔

فلمی شاعر کچھ نشے کی ترنگ میں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ ہی "واہ" کیا اور آنکھیں کھول کر بولا۔

"ہیرو اپنے سوتیلے بھائی کی سازشوں کی وجہ سے جیل میں ہے۔ ہیروئن گھر میں اکیلی اسے یاد کر رہی ہے۔ وہ ڈاکیے کو دیکھ کر اس کی طرف بھاگتی ہے۔ اور پوچھتی ہے بابا کیا میرا کوئی خط آیا؟ ڈاکیہ کہتا ہے۔ نہیں بٹی! تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ ہیروئن دل کو تھام کر سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیتی ہے۔ یہاں سے میوزک شروع ہو جاتا ہے اور ہیروئن گاتی ہے:

کوئی پریم سندیسہ لائے رے
کوئی مجھ کو پاس بلائے رے
یہ اکھیاں دید کی پیاسی ہیں!
جل بھرنے ---------"

کبیر نے ٹوک کر کہا۔

"اگر پریم سندیسہ کی بجائے پریم سموسہ ہو تو زیادہ موزوں ہو گا۔"

فلمی شاعر غضبناک ہو کر دھاڑا۔

"کمینے میرے مکھڑے کا مذاق اڑاتا ہے۔ نکال میری شراب کا پہلا پیگ۔

خبردار جو میری سگریٹوں کو ہاتھ لگایا۔"

کبیر نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے تو پھر پریم سندیسہ نہایت موزوں ترکیب ہے۔ یہ گانا ضرور ہٹ ہو گا۔"

"ایسا کیوں نہیں کہتے۔ لو اور شراب پیو۔"

فلمی شاعر نے کبیر کے گلاس میں مزید شراب انڈیلی' کبیر آہستہ آہستہ دوسرا پیگ پیتا رہا۔ اور خاموشی سے فلمی شاعر کا گیت سنتا رہا۔ جب وہ دونوں شراب پی چکے اور فلمی شاعر بھی اپنے سارے گیت بار بار سنا کر تھک گیا تو پروڈکشن انچارج اندر آیا۔ فلمی شاعر نے اس سے پانچ روپے ایڈوانس لئے اور چپڑاسی سے نان کباب منگوائے' دونوں نے مل کر خوب کھائے۔ فلمی شاعر نشے میں تھا۔ کبیر بھی سرور کے عالم میں تھا۔ فلمی شاعر نے کہا۔

"چلو اس حرامزادے رباب امرتسری کے کمرے میں جاتے ہیں۔ سنا ہے آج کل اس نے ایک کانی لڑکی کو داشتہ رکھا ہوا ہے۔"

"چلو"۔

کبیر نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ دونوں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ سیڑھیوں میں فلم کا ڈائریکٹر ملا۔ اس نے فلمی شاعر کو باہر جاتے دیکھ کر اپنا سر پکڑ لیا۔

"خدا کے لئے گیت مکمل کر کے جانا۔ کل شوٹنگ ہے۔ اگر گیت نہ ہوا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔"

فلمی شاعر نے ڈائریکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے آنکھ مار کر بولا۔

"فکر نہ کرو آج گیت ضرور مکمل ہو گا۔ نہیں تو میں اپنی گردن قلم کر لوں گا۔"

چوک میں دھوپ خوب کھلی ہوئی تھی۔ رائل پارک کے علاقے میں بڑی رونق تھی۔ کبیر اور فلمی شاعر کندھے سے کندھا جوڑے نشے کے عالم میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے چل رہے تھے۔ کونے والی دوکان پر کھڑے ہو کر انہوں نے پان کھائے۔ فلمی شاعر نے پنواڑی سے کہا۔

"بٹ جی! یہ میرا یار ہے۔ اس کا نام کبیر ہے۔ اس نے بھگت کبیر کے خلاف

شوٹنگ کی ہے۔ کہتا ہے میری فلم گولڈن جوبلی کرے گی۔ بٹ جی تم گواہ رہنا۔ میں رباب امرتسری کے پاس جا رہا ہوں۔ چلو یار۔۔۔۔۔۔" رباب امرتسری جو کہ خود شاعر تھا اور راشن کے محکمے میں ملازم تھا۔ رتل پارک کی ایک بلڈنگ میں ایک چھوٹے سے بوسیدہ کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ رباب امرتسری ایک آدھ فلم کا گیت بھی لکھ رہا تھا۔ بلڈنگ کی سیڑھیوں میں فلمی شاعر نے جا کر آواز لگائی۔

"اوئے رباب امرتسری! کمینے کمرے سے باہر نکل آ۔۔۔۔ ہم آ رہے ہیں۔ تیرے باپ آ رہے ہیں۔ چلو کبیر۔۔۔۔۔ آج سالا ہم سے بچ کر نہیں جا سکتا۔"

رباب امرتسری نے اپنے کمرے میں فلمی شاعر کی آواز سن لی تھی۔ اس نے جلدی سے سگریٹوں کا پیکٹ چارپائی کے نیچے پھینک دیا اور لحاف کے اندر گھسی ہوئی کانی داشتہ سے کہا۔

"تم یہیں چھپی رہو"۔

اور خود لحاف سے باہر نکل کر کرسی پر کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ اس کی کانی محبوبہ اتنی مختصر اور اتنی چھوٹی سی تھی کہ لحاف تہہ کر کے رکھنے پر بھی اس کے آثار کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے۔ اتنے میں دروازہ زور سے دھڑدھڑایا۔ رباب نے کنڈی کھول کر فلمی شاعر اور کبیر کا ایک موٹی سی گالی سے خیرمقدم کیا۔ فلمی شاعر نے اس کے گلے میں بانہہ ڈال دی۔

"روح خوش کر دی تم نے گالی دے کر۔ واقعی تم امرتسر کے ہو۔ اس گالی میں امرتسر کے پانی کی طاقت اور مٹی کی خوشبو تھی۔ اچھا یہ بتاؤ حرامزادے! تم۔۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے تھے۔"

"پڑھ رہا تھا"۔

"تمہاری ماں نے کون سا ادیب فاضل کا امتحان دینا ہے سالے!"

"کمینو! تم نے شراب پی رکھی ہے؟"

"اور کیا بزوری شربت پئیں؟"

"مجھے کیوں نہیں پلائی؟"

کبیر نے رباب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پچکار کر کہا۔

"نہ بیٹا! بچے نہیں پیا کرتے"۔

فلمی شاعر نے ناک سکیڑ کر ادھر ادھر سونگھا اور بولا۔

"مجھے عورت کی بو آ رہی ہے' کبیر یہاں ضرور کوئی عورت ہے۔ کیوں اوئے رباب امرتسری! سچ بتا وہ کانی کہاں چھپی ہے؟"

رباب نے بڑا پکا سا منہ بنا کر کہا۔

"خدا کی قسم یہاں کوئی نہیں۔ وہ تو کئی روز سے نہیں آئی۔"

"ہوں میں سب جانتا ہوں' کبیر اس کمرے کی تلاشی لی جائے۔"

"بے شک لے لو۔"

کبیر اور فلمی شاعر نے اٹھ کر چیزیں الٹنا پلٹنا شروع کر دیں۔ فلمی شاعر نے کیل سے لٹکی ہوئی پتلون کی جیبیں بھی دیکھ لیں' اتفاق سے کبیر نے جب رباب امرتسری کا تہہ کیا ہوا لحاف جھاڑا تو اس میں سے کانی محبوبہ نکل کر نیچے دری پر جا گری۔

"وہ رہی وہ رہی سالی"۔

دونوں اس کانی محبوبہ پر ٹوٹ پڑے۔ فلمی شاعر نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ کبیر نے نیچے جھک کر چارپائی کے نیچے سے رباب امرتسری کی سگریٹ کی ڈبیا بھی باہر نکال لی اور اس میں سے سگریٹ نکال کر ایک خود لیا اور ایک فلمی شاعر کو دیا۔ رباب امرتسری کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ کانی محبوبہ نے ناک سکوڑ لیا اور فلمی شاعر کو جھٹک کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کیا ریچھ کی طرح میرا منہ چاٹ رہے ہو۔"

فلمی شاعر نے غرا کر کہا۔

"سالی کامنی کوشل کی طرح نخرے کرتی ہے؟ تو فلمی جنگل میں پھرنے والی لومڑی ہے اور ہم سب تیرے لومڑ ہیں۔ اس کمینے رباب امرتسری سے تجھے کیا ملے گا؟ یہ سوائے امرتسری ہریسہ کھلانے کے اور تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ مگر میں تجھے فلم کی ہیروئن بنا سکتا ہوں۔ میں تم پر ایسا گیت لکھ سکتا ہوں کہ بچہ بچہ تیرا نام لیتا پھرے۔"

رباب امرتسری نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"حرامزادے امرتسری ہریسے کا مقابلہ اپنی کمینی شاعری سے کرتا ہے؟ سالے تم نے سنا نہیں۔

"ایک پاؤ ہریسہ صبح گاہی
بہتر از ہزار مرغ و ماہی"

فلمی شاعر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔
"بکواس بند کر رباب امرتسری۔ میں تو تیرا ہی رباب اٹھا کر تیرے سر پہ دے ماروں گا۔ سن میرا ایک مکھڑا سن۔ لکھا ہے۔

کوئی پریم سندیسہ لائے رے
کوئی مجھ کو پاس بلائے رے"

رباب نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"کیوں اپنی ماں کو بلائے رے
کیوں کرتا ہائے ہائے رے"

فلمی شاعر نے غصے میں آ کر رباب امرتسری کی کانی محبوبہ کے گال کو کاٹ لیا۔ وہ "اوئی" کہہ کر کبیر کی آغوش میں دبک گئی' کبیر نے اسے اپنے اوور کوٹ کے اندر چھپا لیا۔ جب وہ جانے لگے تو کانی محبوبہ کبیر کے اوور کوٹ کے اندر سے نیچے گر پڑی۔ رباب امرتسری نے اسے اٹھا کر جھاڑا اور دروازہ بند کر کے اسے لحاف کے اندر رکھ کر لیٹ گیا۔

(۴)

زیتون نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔
اس سکول میں لڑکیوں کو مینا پرونا' تکیے کے غلافوں' چادروں' میز پوشوں اور رومالوں پر بیل بوٹے کاڑھنا' سویٹروں کی بنائی اور کروشیے کا کام سکھلایا جاتا تھا۔ یہ سکول ایک محلے میں تھا۔ بڑی استانی ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم سی تھی۔ اس کے بال کچھ سفید تھے' اور اس نے سنہرے فریم والی عینک لگا رکھی تھی' اس کے چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑی جہاندیدہ عورت ہے۔ اس نے زیتون کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ زیتون اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ استانی نے رجسٹر کھولتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"
"زیتون"۔
"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"
"فسادات میں مارے گئے تھے"۔
"شادی نہیں ہوئی تمہاری؟"
"ہوئی تھی مگر خاوند نے طلاق دے دی"۔
"کہاں رہتی ہو؟"
"ایک سہیلی کے پاس سمن آباد میں"۔

جب بڑی استانی سہیلی کا نام پوچھنے لگی تو زیتون ذرا گھبرائی۔ اس نے شاہدہ کا غلط نام لے دیا اور پتہ بھی جھوٹ موٹ بتایا۔ استانی عینک اتار کر دوپٹے کے پلو سے اس کے شیشے صاف کرنے لگی۔ پھر عینک لگا کر بولی۔
"دراصل بات یہ ہے کہ ہم کسی لڑکی کو بھی اس وقت تک اپنے سکول میں داخل نہیں کرتے جب تک کہ وہ اپنے ساتھ کسی مدبر آدمی یا عورت کو ضمانت کے لئے نہ لائے۔ کیا تم کسی ایسے آدمی کو لا سکتی ہو؟"
زیتون سوچ میں پڑ گئی' اس کا تو اس شہر میں کوئی بھی مدبر آدمی واقف نہ تھا اور پھر اس کی کیا ضمانت تھی کہ جس کو زیتون مدبر سمجھتی ہو وہ اس استانی کے لئے بھی مدبر ہو؟ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
"دیکھئے میرا اس شہر میں کوئی غمگسار نہیں۔ میں مصیبت زدہ ہوں اور اکیلی

ہوں۔ میرا خاوند مجھے چھوڑ گیا ہے۔ میں شرافت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ میں معمولی پڑھی لکھی ہوں' چاہتی ہوں کہ آپ کے سکول سے کام سیکھ کر اپنی روزی کما سکوں۔ اگر آپ نے ضمانت دلوانے کی شرط رکھی تو مجھے ڈر ہے کہ میں ایسا نہ کر سکوں گی۔ کیونکہ سوائے رشتہ داروں کے میرا یہاں کوئی اور واقف نہیں اور رشتہ داروں کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔"

بڑی استانی نے رجسٹر بند کر دیا۔ زیتون کو ایک گہری اور تیز نگاہ سے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس لڑکی کا کریکٹر اچھا نہیں ہے اور اگر وہ اس کے سکول میں داخل ہو گئی تو اس کی وجہ سے دوسری لڑکیوں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اس نے سر ہلا کر کہا۔

"پھر مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے سکول میں نہیں لے سکتی۔ کیونکہ ہمارے ہاں داخلے کے لئے لڑکی کے ساتھ اس کے کسی رشتہ دار یا ضامن کا آنا ضروری ہے۔"

زیتون پریشان ہو گئی' اسے اپنی چاروں جانب بھیانک چہروں والے ہوس پرست جانور جبڑے کھولے اسے سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتے نظر آئے۔ اس نے منت کرنے کے لہجے میں کہا۔

"استانی صاحبہ مجھے ناامید نہ کیجئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ اگر آپ نے انکار کر دیا تو میں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاؤں گی۔"

بڑی استانی نے ایک جھرجھری لی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس لڑکی کا کریکٹر اچھا نہیں ورنہ ایک شریف لڑکی کو اتنا گڑگڑانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر شریف لڑکیاں کبھی وہاں اکیلی نہیں آتیں' ان کے ساتھ ماں باپ یا رشتہ دار ضرور ہوتے ہیں۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ لڑکی برائی کی زندگی سے توبہ کر کے سکول میں دستکاری سیکھنا چاہتی ہے تو وہ اسے اپنے سکول میں داخل کیوں کرے؟ وہ یہ خطرہ کیوں مول لے؟ کیا خبر یہ لڑکی جو اب مسکین بنی بیٹھی ہے کل کلاں سکول کی کسی لڑکی کو اڑا کر لے جائے۔ توبہ توبہ۔۔۔ میں تو کبھی ایسی لڑکی کو اپنے سکول میں داخل نہیں کروں گی۔

استانی نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔ میں اپنا اصول نہیں توڑ سکتی۔"

ٹھیک ہے کوئی بھی اپنا اصول نہیں توڑ سکتا۔ رشوت لینے والا اپنی روزی اور

مستقبل کی بازی لگا کر رشوت لیتا ہے۔ اور اپنا اصول برقرار رکھتا ہے۔ جھوٹی گواہی دینے والا جیل جانے کا خطرہ مول لے کر جھوٹی گواہی دیتا ہے اور اپنا اصول نہیں توڑتا۔ لوگ دل توڑ دیتے ہیں۔ کمر توڑ دیتے ہیں مگر اصول کبھی نہیں توڑتے۔ اس دنیا میں اصول ہی اشرف المخلوقات ہے۔ خدا نے انسان بنا کر اسے دل دیا۔ انسان نے اصول بنا کر اس کا دل توڑ دیا۔ اصول ہمارے معاشرے کے ہاتھ میں لی ہوئی ڈھال ہے۔ جس کے آڑ میں ہم برائی کو اچھائی کا لباس پہنا دیتے ہیں اور پھر دوسروں سے اپنی برائی اور خودداری کا سکہ بھی منوا لیتے ہیں۔

اصول کی تلوار کا زخم کھا کر زیتون سکول سے باہر نکل آئی۔ گلی سے نکل کر جب وہ بازار میں آئی تو اس نے دیکھا کہ نسواری کوٹ والا لڑکا چوک میں ایک طرف کھڑا سگریٹ پی رہا تھا' یہ لڑکا سمن آباد سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب وہ بس میں سوار ہوئی تو وہ بھی اس کے ساتھ سوار ہوا تھا۔ پھر جب وہ بس میں سے اتری تو وہ بھی اتر پڑا اور زیتون کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اگر کسی دوسرے حالات میں وہ زیتون کا پیچھا کرتا تو شاید زیتون اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی کیونکہ لڑکا خوش شکل تھا۔ لیکن اس وقت وہ اپنی زندگی کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف بدکار زندگی کا دلدل پھیلا ہوا تھا اور دوسری طرف شریفانہ زندگی کا سنگلاخ میدان تھا۔ زیتون نے لڑکے کو کوئی اہمیت نہ دی اور بس سٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ لڑکا بھی وہاں آ کر رک گیا۔ وہ زیتون کے بالکل پاس آ کر رک کر کھڑا ہو گیا۔ اور سگریٹ منہ میں لئے بار بار زیتون کو دیکھنے لگا۔ زیتون کو یہ سارا کچھ بچوں کا کھیل محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ بس سٹاپ پر کھڑی رہی۔ نسواری کوٹ والا کھسکتا کھسکتا اس کے قریب آ کر بولا۔

"ٹیکسی کر لیں؟"

زیتون خاموش رہی۔ لڑکے نے منہ دوسری طرف کر کے سگریٹ کے کش لئے اور پھر جھک کر بولا۔ "میری بات مانیئے۔ ٹیکسی کروا لیتے ہیں۔"

زیتون نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ منحنی سا لڑکا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی بے معنی قسم کی تھیں۔ زیتون کو ہنسی آ گئی اس نے کہا۔

"شکریہ بھائی جان!"

لڑکا کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔

"غنیمت ہے آپ کے لب تو ہلے۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ آپ گونگی ہیں۔"

زیتون نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں بس آ گئی۔ زیتون اس میں سوار ہو گئی۔ بس سمن آباد کی طرف چل پڑی۔ جب وہ سمن آباد کے سٹاپ پر اتری تو اسے معلوم ہوا کہ وہی لڑکا بدستور اس کا تعاقب کر رہا ہے' زیتون نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی اس کے گھر کا علم ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس اجنبی سے یہیں نپٹ لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ رک گئی۔ نسواری کوٹ والا جب اس کے قریب آ گیا تو زیتون نے کہا۔

"آپ کس لئے میرا پیچھا کر رہے ہیں؟"

نسواری کوٹ والا مسکرا کر بولا۔

"دل چاہتا ہے۔"

"اگر شہر کسی دوسری سڑک پر اسی طرح کوئی شخص آپ کی بہن کا تعاقب کر رہا ہو تو آپ گوارا کر لیں گے؟"

نسواری کوٹ والے نے سگریٹ جلا کر کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

زیتون نے پاؤں سے ایک سینڈل اتار کر نسواری کوٹ والے کے سر پر زور سے مارتے ہوئے کہا۔

"اب آپ میرا مطلب ضرور سمجھ گئے ہوں گے۔"

نسواری کوٹ والا ہکا بکا رہ گیا۔ اتفاق سے اس سڑک پر اور کوئی نہیں تھا۔ نسواری کوٹ والے نے جیب سے رومال نکال کر سر پر پھیرا اور غصے میں بولا۔

"آپ بڑی بدتمیز ہیں۔"

زیتون نے دوسری بار سینڈل اٹھایا ہی تھا کہ نسواری کوٹ والا وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ زیتون نے خدا کا شکر ادا کیا اور شاہدہ کے مکان کی طرف روانہ ہو گئی' جہاں اس نے نسواری کوٹ والے کے سر پر جوتا مارا تھا اس جگہ سڑک پر ساتھ ہی ایک ہری بھری کیاری میں گلاب کے کچھ پھول کھلے ہوئے تھے۔ چمکیلی اور گرم دھوپ میں ان مخملیں پھولوں کی نازک اور ریشمی پنکھڑیاں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ ان پھولوں نے بھی زیتون کو نسواری کوٹ والے کے سر پر جوتا مارتے دیکھا تھا۔ مگر وہ خاموش رہے۔ انہوں نے نہ تو نسواری کوٹ والے سے کچھ کہا اور نہ زیتون سے شکایت کی۔ کیونکہ پھول محبت اور خاموشی کا مظہر ہے۔ وہ نہ زیتون بن کر در بدر کی

ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اور نہ نسواری کوٹ پہن کر بس میں سے اترنے والی ہر لڑکی کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ رات بھر نیلی رات میں اپنی آنکھیں بند کر کے سویا رہتا ہے اور پچھلے پہر شبنم کے پہلے قطرہ کے ساتھ ہی آنکھ کھول دیتا ہے اور صبح کی تروتازہ ہوا کے ساتھ گہرے اور پرسکون سانس لیتا ہے۔ پھر وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر مشرق میں طلوع ہونے والے گول گول' پراسرار' روشن اور زرتار سورج کا استقبال کرتا ہے۔ اور جب پہلی بس سمن آباد کی طرف سے مٹی اور گندے تیل کا بو اڑاتی اس کے قریب سے گزرتی ہے تو وہ اپنی پنکھڑی کا رومال ہونٹوں پر رکھ کر آنکھیں بند کرتا ہے۔ وہ خاموش ہے اور پر محبت ہے اور گہرا ہے۔ وہ محبت کرتا ہے۔ اور خاموش رہتا ہے۔ کوئی بچہ اسے توڑ کر اپنے کوٹ میں لگا لیتا ہے اور پھر کہیں راستے میں ہی اسے پھینک دیتا ہے۔ اور وہ کچھ نہیں کہتا۔ وہ ٹہنی سے جدا ہوتے ہوئے بھی مسکراتا ہے ۔ وہ سڑک پر گرتے ہوئے اور کسی بس یا کار یا تانگے کے پہیوں تلے کچلتے وقت بھی مسکرا رہا ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ' ہر مقام اور ہر حالت میں پھول ہے۔ تماش بین کے گلے میں بھی' دولہا کے سہرے میں بھی اور قبر کے پتھر پر بھی۔۔۔۔۔! گلاب کا پھول زندہ باد!!!

اگلے روز زیتون دستکاری کے ایک اور سکول جا پہنچی۔ وہاں بھی وہی حالات پیش آئے۔ بڑی استانی نے بغیر کسی ضمانت کے اسے سکول میں لینے سے انکار کر دیا۔ زیتون ناامید ہو کر باہر آ گئی اور سڑک کے کنارے ایک طرف کو چل پڑی۔ پرانی انارکلی سے ہو کر وہ ٹولنٹن مارکیٹ کی طرف آ رہی تھی کہ اسے کبیر نظر آیا۔ وہ فٹ پاتھ پر دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے بڑے مزے مزے چلا جا رہا تھا۔ زیتون کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اسے یوں لگا جیسے سارا شہر اس کا اپنا ہے۔ اور ہر آدمی اس کا دوست ہے۔ اور اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ اپنی ناکامی کا سارا غم بھول گئی۔ اس نے قریب جا کر کبیر کو بلا لیا۔ کبیر رک گیا۔ زیتون نے نقاب الٹ دیا۔

"کہو زیتون کیا حال ہے؟ ادھر کہاں سے آ رہی ہو؟"

زیتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں گھوم رہے ہو۔ کیا لائبریری آئے تھے؟"

کبیر نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"یہاں نہر کے دفتر میں میرا ایک یار مستری ہے اسے ملنے آیا تھا۔"

وہ دونوں فٹ پاتھ پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ زیتون نے کہا۔

"چائے پیو گے؟"

"میرے پاس آدھی ڈبی سگریٹ اور چھ آنے ہیں۔"

زیتون مسکرائی اور بولی۔ "فکر نہ کرو۔ میرے پاس پیسے ہیں۔"

دونوں یونیورسٹی کے پاس ایک ہوٹل کے کیبن میں جا کر بیٹھ گئے۔ کبیر نے پوری آستینوں کا بسنتی سویٹر پہن رکھا تھا۔ اور گلے میں قرمزی رنگ کا مفلر پڑا تھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑے اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی زیتون کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیتا تھا۔ زیتون اس انتظار میں رہی کہ وہ اس سے پوچھے کہ وہ آج کل کیا کر رہی ہے۔ اور کہاں رہتی ہے؟ مگر کبیر نے اس قسم کا کوئی بھی سوال نہ کیا۔ آخر زیتون سے نہ رہا گیا' اس نے خود ہی بات چھیڑ دی اور ساری روئیداد کہہ ڈالی۔ عورتیں اپنی کہانی سنانے کو ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔

کبیر نے سگریٹ کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بڑے غور سے زیتون کی داستان کا ایک ایک لفظ سنا۔ زیتون بڑی حیران ہوئی کہ اس شخص نے اپنی طرف سے کچھ پوچھنے کی ذرا سی بھی خواہش نہیں کی اور اب کس اشتیاق اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہا ہے۔ زیتون زیادہ پریشان نہ ہوئی کیونکہ وہ کبیر کی عجیب و غریب شخصیت سے کچھ کچھ متعارف ہو چکی تھی' جب زیتون نے اپنی بات ختم کر لی تو کبیر نے اس کی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

"تمہیں ایک ایسا مرض ہو گیا ہے۔ جس کا واحد علاج شادی ہے۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں زیتون؟"

زیتون کو کبیر کے منہ سے شادی کا لفظ کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"مجھ سے کون شادی کرے گا؟"

"کوئی نہ کوئی بیوقوف مل سکتا ہے۔"

"میں بیوقوف سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

کبیر نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے دو بار عقلمندوں سے شادی کی اور انہوں نے دونوں دفعہ تمہیں آگے

بیچ دیا۔ بیوقوف کم از کم تمہیں کسی کے ہاتھ فروخت نہیں کرے گا۔"

زیتون خاموش ہو گئی' کبیر نے چائے کی پیالی میں چینی ہلا کر کہا۔

"ایک بیوقوف تو یہ میرا مستری یار بھی ہے۔ تم کہو تو میں اس سے بات کروں۔"

زیتون نے گہرا سانس لیا اور سر جھکا لیا۔

"اس کی تنخواہ ایک سو پچیس روپے ماہوار ہے۔ پہلی بیوی مر چکی ہے۔ اس میں سے دو لڑکیاں ہیں۔ ایک کی عمر چھ سال ہے۔ اور دوسری آٹھ برس کی ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ دو کمروں والے مکان میں رہتا ہے۔ گھر میں اور کوئی نہیں۔ ماں مر چکی ہے۔ بہنیں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ بھائی کوئی نہیں۔ وہ شادی کی فکر میں ہے۔ میرا کہا وہ ضرور مان لے گا اور تم سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ کہو کیا خیال ہے؟"

زیتون سوچ میں پڑ گئی۔ اسے اپنی گذشتہ زندگی کے بھیانک واقعات یاد آ گئے۔ اور موجودہ بے مہار اور آوارہ زندگی کا خیال آیا اور آنے والی زندگی کے اندیشے سامنے آ گئے۔ اس کے دل نے کہا شادی کر لو۔ پھر سوچنے لگی ایک سو پچیس میں دو لڑکیوں کے ساتھ کیسے گذارہ کرے گی؟ اور پھر اس کے ہاں بھی بچے ضرور ہوں گے۔ کہیں وہ گڑھے سے نکل کر کنوئیں میں نہ گر پڑے! وہ سوچتی رہی اور کبیر چائے پیتا رہا۔ وہ زیتون کو اچھی طرح غور و فکر کا موقع دینا چاہتا تھا۔ نہیں نہیں زیتون نے سوچا۔ اسے کہیں نوکری کر کے اپنی زندگی تنہا بسر کرنا چاہئے۔ شادی میں بڑی مشکلات اور قباحتیں ہیں۔ اگر اس کے خاوند کو معلوم ہو گیا کہ وہ پہلے دو بار فروخت ہو چکی ہے اور لوگ اس سے پیشہ کرواتے رہے ہیں۔ تو اس کی گھریلو زندگی اذیت ناک ہو جائے گی۔ گھر اس کے لئے دوزخ بن جائے گا۔ اور اگر اس کا بچہ بھی ہو گیا تو وہ اس لئے کہاں ماری ماری پھرے گی؟ نہیں نہیں وہ شادی نہیں کر سکتی۔ پرانی زندگی کے داغوں نے اس کے لئے شادی کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ اب تو وہ اکیلی ہے۔ بدنامی سہہ کر بھی تنہا زندگی بسر کر سکتی ہے۔ شادی کے بعد وہ ایسا نہ کر سکے گی۔ اور پھر وقت بھی گذر جائے گا۔ ہو سکتا ہے۔ پھر اسے کہیں بھی نوکری نہ مل سکے۔ اور اپنے پیٹ کے علاوہ ایک بچہ بھی پیٹ بھرنے کو اس کے ساتھ ہو۔ زیتون نے سوچا کہ ان خدشات کا اظہار کبیر سے بھی کر دینا چاہئے۔ اس نے کہا۔

"اگر اسے میری گذشتہ زندگی کے بارے میں معلوم ہو گیا تو کیا وہ مجھے گھر میں بسائے رکھے گا؟"

"میرا خیال ہے وہ تمہیں گھر سے باہر نہیں نکالے گا۔ کیونکہ جہاں تک میں اسے جانتا ہوں۔ وہ بیوقوف ہے اور بیوقوف آدمی سنگدل نہیں ہوا کرتے۔ ہماری دنیا کا سارا ظلم اور ناانصافی عقلمندوں کی پیداوار ہے اور میرا یار مستری کم عقل ہے۔ بلکہ بے عقل ہے اور اس وقت اس سے کوئی بھی عورت شادی کرنے کو تیار نہیں۔ وہ تم سے بڑی محبت کرے گا۔"

زیتون نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"ان مردوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ شادی کی پہلی رات کچھ اور ہوتے ہیں اور ایک سال بعد کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب اسے میری پہلی زندگی کی ٹھوکروں کا علم ہو جائے تو وہ بھی مجھے ٹھوکر مار کر گھر سے باہر نکال دے۔ پھر میرے لئے کوئی ٹھکانہ نہ ہو گا۔"

کبیر نے دوسری پیالی کے آخری قطرے حلق میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ بھی ایسا ہی کرے۔ کیونکہ عقل روزبروز ترقی کر رہی ہے اور ہر بے عقل عقلمند ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مستری ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ اتنا بے وقوف ہے کہ کوئی اس سے عقل بھی نہیں سیکھ سکتا۔"

"میں یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"تو پھر دوسرے خطرے مول لینے کے لئے تمہیں تیار رہنا چاہئے۔"

زیتون نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور وہ اداس ہو گئی۔

کبیر نے سگریٹ جلایا اور اس کے مزے مزے کش لینے لگا۔ پھر بولا۔

"اگر میں تمہارا بوجھ اٹھا سکتا تو میں خود تم سے شادی کر لیتا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ یہاں تو شادی کے بعد میرا بوجھ بھی تمہیں ہی اٹھانا پڑے گا۔"

زیتون کے چہرے پر ایک بار امید کی کرن سی چمکی۔ اس نے کبیر کی طرف پرامید نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

"کاش ایسا ہو سکتا۔"

کبیر نے سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر کہا۔

"لیکن ایسا نہیں ہو سکتا ناں ـــــ میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

زیتون نے کہا۔

"اگر میں تمہارا بوجھ اٹھانے پر تیار ہو جاؤں تو؟"

کبیر مسکرایا۔

"کیسی بچوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میرے ساتھ تم بھی بھوکوں مرو؟ میں ایک بے گناہ عورت کو اپنی پریشانیوں اور قرضوں میں شریک نہیں کر سکتا۔"

"ہم دونوں کوئی کام ڈھونڈ لیں گے اور جی لگا کر محنت کریں گے۔"

"میں کام کے سخت مخالف ہوں۔"

"کیوں؟"

"کام غیرقدرتی فعل ہے۔"

"مگر شادی کے بعد اگر تھوڑا بہت کام کرنا پڑے تو کیا حرج ہے؟"

"اسی لئے تو میں شادی نہیں کرتا۔"

"تم بڑے عجیب و غریب ہو۔"

"صرف عجیب ہوں۔ غریب نہیں ہوں۔"

کیبن میں ایک پل کے لئے خاموشی چھا گئی۔ کبیر چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور زیتون اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کہیں نہ کہیں نوکری تلاش کرے گی اور باقی ماندہ زندگی محنت مزدوری کر کے شرافت سے بسر کر دے گی اور کسی مرد کے ساتھ شادی کر کے کسی قسم کی تباہی کا خطرہ نہیں مول لے گی۔ اس نے کبیر سے اپنے اس فیصلے کا ذکر کیا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

"تم شادی کے بغیر گذارہ کر سکتی ہو۔ لیکن مرد کے بغیر گذارہ نہیں کر سکتیں۔"

"یہ میں بعد میں سوچ لوں گی۔"

کبیر نے میز پہ ہاتھ مار کر کہا۔

"بہت خوب ـــــ میں بعد میں سوچنے والوں کی قدر کرتا ہوں کیونکہ بعد میں سوچنے والے بیوقوف ہوتے ہیں اور دنیا کو اس وقت بیوقوفوں کی ضرورت ہے۔ چلو اب چلیں اور جتنی بھی ہو سکے اس دنیا میں بیوقوفی پھیلائیں۔"

زیتون ذرا سی مسکرائی۔ کبیر نے خوش ہو کر کہا۔

"تمہارے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی ہے۔ یہ بیوقوفی کی پہلی فتح ہے۔"

اتنے میں بیرا بل لے آیا۔ زیتون نے بل ادا کیا اور وہ دونوں کیبن سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ یونیورسٹی کے بس سٹاپ پر آ کر زیتون بس میں سوار ہونے لگی تو اس نے پوچھا۔

"پھر کب ملاقات ہو گی؟"

"رات کو بارہ بجے کے بعد میرا دروازہ ہر آدمی پر کھلا ہے۔"

اتنا کہہ کر کبیر نے سگریٹ پھینکا۔ دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے اور بڑے مزے سے ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔

(۴)

کبیر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتا جب شیزان ہوٹل کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی ہوٹل کی سیڑھیوں پر پانی سے بھرا ہوئے کٹوروں میں گلاب اور نرگس کے پھول رکھے بیچ رہا ہے۔ کبیر اس آدمی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ نرگس کے کھلے ہوئے پھول دیکھ کر مسکرائے۔ پھول اندھے ہوتے ہیں لیکن وہ آنکھوں والے سے زیادہ دیکھتے ہیں۔ کبیر کے رگ و ریشے میں نرگس کے پھولوں کی دھیمی دھیمی میٹھی میٹھی مہک سمانے لگی۔ اس نے ایک پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ پھول بیچنے والے نے آج تک ایسا گاہک نہیں دیکھا تھا۔ کبیر نے آنکھیں کھولیں تو اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ تھا اور سردیوں کی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس نے چار آنے کے نرگس کے چار پھول لئے اور بیڈن روڈ کی طرف آ گیا۔ بیڈن روڈ پر ٹریفک کا شور اور ہنگامہ دیکھ کر نرگس کے پھول پریشان سے ہو گئے۔ کبیر نے پھولوں کو پیٹھ پیچھے کر لیا۔

وہ رائل پارک کے پچھواڑے اپنے ایک فلمی اخبار نویس دوست کے دفتر میں آ گیا۔ یہاں رباب امرتسری بھی بیٹھا تھا۔ اس نے کبیر کو دیکھ کر نعرہ لگایا

"آ گیا میرا بھگت کبیر۔"

اور جب اس نے کبیر کے ہاتھ میں نرگس کے پھول دیکھے تو چیخ مار کر بولا۔

"آہ نرگس کے پھول! کبیر ہی نرگس کے پھول لا سکتا ہے۔"

کبیر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو۔ تم گوبھی کے پھول ہو۔ تمہیں نرگس کے پھولوں سے کیا لگاؤ وہ بھینسا ایڈیٹر کہاں ہے؟"

رباب امرتسری نے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

"اندر ہے"۔

رباب امرتسری کا سرخ و سپید چہرہ مزید سرخ ہو گیا اور وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"سموکنگ کر رہا ہے۔"

اور پھر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ معلوم ---- ہوا کہ اندر اس کی کالی موٹی بھینس نما محبوبہ آئی ہوئی ہے۔ اور وہ اس سے محبت کر رہا ہے۔ کبیر نے نرگس کے پھول میز پر رکھے اور رباب امرتسری کے ساتھ بند دروازے کے سوراخوں میں جھانکنے لگا۔ رباب امرتسری کا چہرہ خوشی سے لال ہو رہا تھا اور وہ تیز سانس لے رہا تھا۔ کبیر پلٹ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رباب امرتسری کو بھی کھینچ کر صوفے پر بٹھلا لیا۔

اتنے میں بھینسا ایڈیٹر اور اس کی موٹی محبوبہ باہر آ گئے۔

"آؤ بھگت کبیر جی آؤ!"

موٹی محبوبہ نے کبیر کو سلام کیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ٹھیک کیا اور پھر کبیر کی طرف دیکھ کر بھینس کی طرح مسکرانے لگی۔ ایڈیٹر نے میز پر نرگس کے پھول دیکھ کر کہا۔

"یہ پھول کہاں سے آ گئے؟ ضرور بھگت کبیر لایا ہو گا۔"

موٹی عورت چہک کر بولی۔

ہائے نرگس کے پھول کتنے پیارے ہیں۔ میں تو آج نرگسی کوفتے کھاؤں گی۔"

ایڈیٹر نے موٹی عورت کی گردن پر مکا مار کر کہا۔

"آج تیرے کوفتے نہ بنائے جائیں"۔

"ہائے ہائے کوفتوں کے لئے میں ہی رہ گئی ہوں کیا؟"۔

موٹی عورت نے نرگس کے پھول اپنے چوڑے نتھنوں کے پاس لے جا کر اس زور سے اوپر سانس کھینچا کہ پھول کی نازک پتیاں کانپنے لگیں۔ کبیر نے آگے بڑھ کر پھول چھین لئے۔

"ہائے کبیر جی! میں تو نرگس کی عاشق ہوں"۔

"تم ایک بھینس ہو۔ ڈنگر ہو، تمہیں ٹانڈے کھانے چاہئیں۔ گونگلو کھانے چاہئیں۔ نرگس کے پھولوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

رباب امرتسری پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ موٹی محبوبہ ناراض ہو کر اٹھی، اور اپنے ایڈیٹر بھینسے کی گردن پر زور دار مکا مار کر چپل سٹپٹاتی باہر نکل گئی۔ بھینسے ایڈیٹر نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ہائے تم لوگوں نے مجھ سے میری محبوبہ کو جدا کر دیا۔ وہ ناراض ہو گئی ہے۔

اب میں کمرہ بند کر کے بین کس کے آگے بجاؤں گا؟"

کبیر نے نرگس کے پھولوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی تصویر کے سامنے بیٹھ کر۔ رباب امرتسری کے سامنے بیٹھ کر بین بجا سکتے ہو۔ مگر نرگس کے پھولوں کے کوفتے نہیں بنا سکتے۔"

رباب امرتسری نے جیب میں سے کوارٹر نکال کر اس کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"میں بھینسا نہیں ہوں۔ میں تو ختن کے جنگل کا ایک ہرن ہوں۔"

ایڈیٹر نے کہا۔

"تم گدھے ہو۔"

کبیر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

گدھے کی توہین مت کرو بھینسے ایڈیٹر ---- گدھا پیغمبروں کی سواری رہا ہے۔ گدھا مقدس جانور ہے۔ گدھا بے وقوف ہے اور ہمیں بے وقوفوں کی ضرورت ہے"۔

رباب امرتسری نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔

"میں بیوقوفوں کا جام صحت پیتا ہوں۔ زندہ باد۔ بیوقوف لوگ!"

"زندہ باد۔ بیوقوفی"۔

کبیر نے ایڈیٹر کا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تم بھی ہاتھ اوپر اٹھاؤ بھینسے! تمہارا جام صحت پیا جا رہا ہے"۔

بھینسا ایڈیٹر بڑا خوش ہوا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ رباب امرتسری نے جیب سے روپے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

"اور شراب منگاؤ کمینو! ---- آج میری گردن پر چھری چلاؤ۔ آج میں ایک پروڈیوسر کی گردن پر چھری چلا کر آیا ہوں"۔

کبیر نے روپے لے کر چپڑاسی کو آواز دی۔

"بھوپت ڈاکو! لائن میں حاضر ہو جاؤ۔"

بھوپت ڈاکو یعنی چپڑاسی فوراً آ گیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہاں شراب آ گئی اور وہ تینوں مل کر جام لنڈھانے لگے۔ وہ شام تک بیٹھے وہاں شراب پیتے اور اودھم مچاتے رہے۔ ابھی بوتل خالی نہیں ہوئی تھی، کہ ایڈیٹر کی وہی کالی محبوبہ آ گئی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایڈیٹر کی ایک پرانی محبوبہ اندر آ گئی۔ ایڈیٹر نے اپنی کالی محبوبہ کو یقین

دلا رکھا تھا۔ کہ وہ اپنی پرانی محبوبہ سے بالکل نہیں ملتا۔ اب جو وہ اچانک آ گئی تو ایڈیٹر پریشان ہو گیا۔ بھینس نما کالی محبوبہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے پھنکار مار کر پوچھا۔

"تو یہاں کیا لینے آئی ہے حرامزادی ؟"

پرانی محبوبہ نے غرا کر کہا۔

"تیری ماں کے یار سے ملنے آئی ہوں۔"

پرانی محبوبہ پورے اعتماد سے بول رہی تھی۔ کیونکہ اس کو بھی ایڈیٹر نے یقین دلا رکھا تھا ۔ کہ وہ کالی کلوٹی محبوبہ سے کبھی نہیں ملتا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے چوری چھپے دونوں سے یارانہ کر رکھا تھا۔ بد قسمتی سے آج ان دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔

رباب امرتسری زور دار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"کیا شاعری ہو رہی ہے"۔

موٹی عورت نے نوارد عورت کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ پرانی محبوبہ کچھ دبلی تھی مگر اس میں چیتے ایسی طاقت اور پھرتی تھی۔ اس نے میز پر سے گلاس اٹھا کر موٹی محبوبہ کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ وہ ہتھنی کی طرح طیش میں آ کر اٹھی اور اس سے گتھم گتھا ہو گئی۔ کبیر نے سگریٹ لگا لیا اور میز پر بیٹھ کر اس دلچسپ لڑائی کا تماشا دیکھنے لگا ۔ رباب امرتسری نے بوتل اٹھا لی اور لہرا لہرا کر انہیں داد دینے لگا۔

"شاباش عورتو! جانے نہ پائے۔ ایسا گھونسہ مارو کہ ناک اڑ جائے۔"

ایڈیٹر کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے چیخ مار کر چپڑاسی سے کہا۔

"بھوپت! دفتر کے دروازے کھڑکیاں بند کر دو۔ کوئی اندر نہ آئے۔"

اور خود بچاؤ کرانے لگا۔ جب وہ دونوں کے درمیان میں آیا تو دونوں عورتوں نے بے تحاشا اسے مارنا شروع کر دیا۔ ایڈیٹر گیند کی طرح اچھل کر پرے ہٹ گیا۔ دونوں عورتیں پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئیں۔ قمیضوں کے گریبان پھٹ گئے۔ دبلی عورت کے بالوں کو موٹی عورت نے پکڑ رکھا تھا اور اس کے پیٹ میں لاتیں مار رہی تھی۔ اچانک دبلی عورت غش کھا کر گر پڑی ۔ موٹی عورت نے اسے فرش پر گرا دیا۔ اور پھنکارتی ہوئی اپنے بال درست کرنے اور اسے گالیاں دینے لگی۔ رباب امرتسری نے جلدی سے دبلی عورت کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ایڈیٹر

پاگلوں کی طرح بڑبڑ کرتا کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

"تم میرا بیڑا غرق کر کے ہی رہو گی۔ اب اس دفتر کا نیلام اٹھے گا۔

میرا کاروبار تباہ ہو گیا۔ میں برباد ہو گیا"۔

موٹی عورت نے ایڈیٹر کو گردن سے دبوچ لیا۔

"یارانے لگانے سہل نہیں ہیں میرے دلیپ کمار۔ آج تو میں نے معاف کر دیا۔ کل اگر یہ اس دفتر میں آئی تو میں اس کی انتڑیاں باہر نکال دوں گی۔ میں بھی ججو پڑنگ کی بیوی رہ چکی ہوں۔ ہاں ---"

اتنا کہہ کر اس نے برقعہ اوڑھا اور چپل گھسیٹتی باہر نکل گئی۔ دبلی عورت کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ بھوپت ڈاکو نے اس کے جوتے اتار دیئے ۔ کوئی بیس منٹ کے بعد عورت کو ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"کیا ہوا تھا؟"

ایڈیٹر نے غصے میں آ کر کہا۔

حرامزادیو ! تم میرا دیوالہ نکال کر رہو گی۔ میں تو آج ہی دفتر پر تالا لگا کر جوگی ہو رہا ہوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

کبیر نے محسوس کیا کہ اب کھیل ختم ہو گیا ہے اور اس سے زیادہ دلچسپ ڈرامہ اب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ رباب امرتسری کے ساتھ دفتر سے باہر نکل آیا۔ دروازے تک ایڈیٹر کی گالیاں ان دونوں کا تعاقب کرتی رہیں۔ کبیر کو اس ساری خوفناک لڑائی کے دوران جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حنا کی خوشبو تھی۔ جتنی دیر کمرے میں عورتوں کی جنگ ہوتی رہی فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو پھیلی رہی۔ دراصل دونوں عورتیں حنا کا عطر لگا کر آئی تھیں۔ لڑائی ہوئی تو عطر کی مہک مزید اڑنے لگی۔ عورتوں کے غضبناک چہرے پھٹے ہوئے کپڑے' لہراتے مکے ۔ ہاتھوں میں الجھے ہوئے سروں کے بال' تیز تیز سانس' انتہائی گندی گالیاں اور حنا کے عطر کی خوشبو! جتنی دیر کبیر میز پر بیٹھا دونوں عورتوں کی جنگ دیکھتا رہا' اسے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ کسی دلہن کے حجلہ عروسی میں بیٹھا ہے۔ یہ سب کچھ شادی کا ماحول ہی تو تھا۔ حنا کی خوشبو ٹوٹی چوڑیاں ' بکھرے بال۔ پھٹے گریبان --- باقی رہا لاتیں 'گھونسے اور گالیاں تو یہ شادی کے بعد کی باتیں تھیں۔ بہرحال تعلق ان کا بھی شادی سے ہی تھا۔

دونوں میکلوڈ کے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔ رباب امرتسری کی جیب میں کچھ روپے تھے۔ انہوں نے وہاں کھانا کھایا۔ کافی پی اور سگریٹ سلگا کر باتیں کرنے لگے۔ شراب کا نشہ اتر چکا تھا۔ صرف گرانی باقی تھی' رباب امرتسری شادی شدہ تھا۔ اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ وہ اپنے بچوں کی باتیں کرنے لگا۔ کبیر خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اگرچہ اسے رباب امرتسری کے بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہر باپ کو اپنے بچوں کی تعریف کرنے کا مرض ہوتا ہے۔ ایک بات پر کبیر نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو رباب بولا۔

"جب تمہارے ہاں بچے ہوں گے۔ تو پوچھوں گا۔ پھر تمہیں ان کی ہر بات اچھی لگا کرے گی"۔

کبیر نے منہ سکیڑ کر کہا۔

"میرے ہاں یہ نوبت نہیں آئے گی"۔

"کیوں؟ کیا تم بچے پیدا نہیں کرو گے؟"

"میں شادی ہی کے خلاف ہوں"۔

"گویا تم شادی نہیں کرو گے؟"

"بالکل نہیں۔ کیونکہ میری رائے میں انسان شادی کے بعد اپنی آدھی شخصیت کسی دوسرے کے حوالے کر دیتا ہے۔ جب بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو اس کی بقیہ آدھی شخصیت مزید ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔"

"تو کیا تم آزاد تعلقات کے حق میں ہو؟"۔

"میں تو اس کے حق میں ہوں اور نہ اس کی مخالفت ہی کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے جو آدمی ایسا کر سکتا ہے اور ایسا کرنے کے بعد اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہے اس کے لئے یہی اچھا ہے۔ یہ تو ایک انتہائی کڑوی دوا ہے۔ جو مریض اسے حلق کے اندر اتار کر ہضم نہیں کر سکتا اس کے لیے وہی سیدھی سادی زندگی ہی اچھی ہے۔ کہ شادی کی' بچے پیدا کئے' ان کے جھنجھٹوں میں اپنا سر سفید کیا اور بوڑھے ہو کر مر گئے"۔

"لیکن تم شادی شدہ زندگی کی دلچسپیوں اور مسرت سے بھرپور لمحات کو کیسے جھٹلا سکتے ہو! تم بچوں کے بیمار ہو کر رونے اور چلانے کو سامنے رکھ کر گھریلو زندگی سے

دامن کشاں ہو مگر اس معصوم لمحے کو بھول گئے ہو جب تم تھکے ہوئے گھر داخل ہوتے ہو اور تمہارا بچہ بھاگ کر تمہاری ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے۔"

کبیر نے سگریٹ کا کش اڑا کر کہا۔

"یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں میں تم لوگوں کے لئے چھوڑتا ہوں۔ تمہاری مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی چائے کے برتن طشت میں رکھے تنی ہوئی رسی پر چل رہا ہو۔ وہ تو کسی قدم پر بھی گر سکتا ہے۔ اور ان خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے چینی کے برتن ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ ایک اعلیٰ اور ناقابل شکست مسرت کا خواب دیکھا ہے۔ ایسی مسرت جو حوادث زمانہ کے طوفان میں چٹان کی طرح سینہ تانے کھڑی رہتی ہے اور اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہل سکتی"۔

"تم اتنے بڑے معاشرے میں رہ کر اپنے آپ کو الگ تھلگ کیونکر رکھ سکتے ہو! کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے کسی فعل کا براہ راست یا بالواسطہ ہمارے معاشرے پر اثر نہیں پڑتا یا ہمارا معاشرہ اپنے افعال سے تمہاری شخصیت کو متاثر نہیں کر رہا۔ نہیں نہیں کبیر تم اس طرح نہیں سوچ سکتے۔ اگر تمہاری طرح ہر آدمی سوچنے لگے۔ تو یہ معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے۔ اور ہماری ایک بھی اخلاقی قدر سلامت نہ رہے۔"

"ہر آدمی اس طرح نہیں سوچ سکتا۔ میری طرح سوچنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں"۔

"ٹھیک ہے لیکن برائی اپنی کم سے کم حیثیت میں بھی برائی ہی ہوتی ہے۔ تخریب تخریب ہی ہوگی۔ خواہ ایک شہر تباہ کر دیں خواہ کسی مکان کی دیوار گرا دیں"۔

کبیر نے جھنجھلا کر کہا۔

"تم امرتسر کے کلچر فروش ہو۔ ہریسہ کھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرنے والوں میں سے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ یہ دور مکانوں کی دیواریں گرانے کا دور ہے۔ شہروں کو نیست و نابود کرنے کا دور ہے۔ ملبہ' ہر طرف ملبہ ہی ملبہ--- تاکہ بالکل نئے' کشادہ' ہوادار اور صاف ستھرے صحت مند مکانات کی بنیادیں کھڑی کی جا سکیں۔ تمہاری ہزار سالہ اخلاقی قدروں نے انسانیت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ جس اخلاقی نے کبھی انسان کو انسان سے ہمدردی کی درس دیا تھا۔ اب لوگ اسی اخلاق کا لبادہ اوڑھ کر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں"۔

رباب امرتسری نے سگریٹ سے سگریٹ جلا کر کہا۔

"تم سب کچھ ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اگر تمہیں برا نہ لگے تو مجھے ایک بات بتا دو۔ وہ یہ کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم نکمے رہ کر، شادی نہ کر کے، اور اپنے قرض خواہوں سے بھاگ کر اس معاشرے کی کوئی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہو؟"

کبیر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے ماتھے پر انگلی پھیر کر کہا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خدمت کرنے والوں کے سخت مخالف ہوں۔ چاہے وہ معاشرے کی خدمت کرنے والے ہوں، چاہے ادب کی اور چاہے انسانیت کی--- یہ لوگ حقیقت میں مجھ سے بھی زیادہ نکمے ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو دفتر میں کلرک بن کر کام تو نہیں کر سکتے اور کلرکوں کی خدمت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ دفتر کے کام سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ کام بھی نہیں کرتے اور خادم قوم بھی کہلواتے ہیں۔ ادیب بن کر ناول، کہانی یا نظم نہیں لکھ سکتے۔ اور نقاد بن کر ادب کی یا زبان کی خدمت کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ غیر تخلیقی، نکمے اور خود غرض اور بغیر کسی کام کے شہرت اور نیک نامی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ بلکہ الٹا یہ لوگ کام کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہوتے ہیں۔ لوگوں کو چاہئے کہ پہلے وہ اپنی خدمت کرنا سیکھیں۔ پہلے انہیں اپنے گھروں کی چار دیواری کو خوبصورت اور دلفریب بنانا چاہئے۔ اور اس کے بعد دوسرے کے مکان کا "خدمت" کے نام پر دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔"

رباب بڑے غور سے کبیر کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے سگریٹ جھاڑ کر کہا۔

"لیکن کبیر! کریم بخش نے جو اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ اس کو کبھی نہیں جھٹلا سکتے۔ انہوں نے ہماری زبان کو بامحاورہ اور سلیس کیا ہے۔ اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے مستند کتابیں لکھی ہیں"۔

کبیر نے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی موسیقارہ لتا منگیشکر نے کریم بخش سے بڑھ کر اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ اور کر رہی ہے۔ آج لتا منگیشکر کی وجہ سے مدارس کا ایک عام شہری بڑی آسانی سے "کیف میں ڈوبی ہوئی تھی وہ طلسمات کی رات" گا رہا ہے۔ نہ وہ "کیف" کے معنی جانتا ہے۔ اور نہ "طلسمات" کے --- لیکن وہ گاتا ہے اور گائے جاتا ہے۔ کریم بخش اگر اپنے مضامین کے ذریعے اسے اردو سکھلانا چاہتے تو

وہ "کیف" اور "طلسمات" کے مقامات سے بہت پہلے بھاگ چکا ہوتا۔ باقی زبان کی موشگافیاں، عمرانیات کا لسانیات پر اور لسانیات کا نفسیات پر لسانیاتی نفسیات کا عمرانیات تاریخ پر اثر اور اس کی تحقیق و تدوین --- یہ سب بے مغز بے رس اور مردہ باتیں ہیں۔ یہ وہ پھاوڑے ہیں۔ جن کی مدد سے گڑے مردے اکھیڑے جاتے ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ مردہ جسموں کو غسل دینے والے ہوتے ہیں۔ ہماری اردو زبان زندہ ہے۔ اور ان خدمت کرنے والوں غسل دینے والوں کی کارستانیوں کے باوجود زندہ ہے۔ اور جب تک اس زبان میں شعر کہنے والے، ناول لکھنے والے اور کہانیاں سنانے والے زندہ ہیں۔ یہ زندہ رہے گی۔"

کبیر نے پہلا سگریٹ رکھدان میں مسل کر دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔

رباب امرتسری نے پیالی میں بچی ہوئی ٹھنڈی کافی کا گھونٹ حلق میں انڈیلا اور مسکرا کر بولا۔

"لیکن کبیر تم نے میری اصل بات کا جواب نہیں دیا"۔

"میں وہیں آرہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ تمہیں میرے نکمے، مقروض اور بے عمل ہونے پر اعتراض ہے۔ میرے بھائی اول تو یہ میرے ذاتی فعل ہیں۔ میرا قرض خواہ صرف مجھے تنگ کرتا ہے۔ تمہیں نہیں۔ میرے کام نہ کرنے سے صرف مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اور میں کبھی کبھی شراب پیتا ہوں تو اپنا جگر خراب کرتا ہوں تمہارا نہیں۔ پھر تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟"

رباب امرتسری نے ہنس کر کہا۔

"اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو میں کبھی اعتراض نہ کرتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ تم اپنے نکمے پن، مجرد کی زندگی اور اس سے متعلق خیالات کا پرچار بھی کرتے ہو اور اس طرح ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم اس کے کھرے یا کھوٹے ہونے کے بارے میں آواز بلند کر سکیں"۔

کبیر نے میز پر مکا مار کر کہا۔

"تو پھر تم جاؤ جہنم میں۔ تم لوگ مجھ سے کیوں پوچھنے آتے ہو۔ میں نے اپنے خیالات کے پمفلٹ نہیں چھپوائے۔ ان کی تبلیغ کے لئے کسی جگہ جلسہ نہیں کیا۔ تم پوچھتے ہو تو مجھے یہ باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ کیونکہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

رباب امرتسری نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کبیر کا ہاتھ کھینچ کر بولا۔

"اب اٹھو میرے جگت کبیر۔۔۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔"

۵

بہار کا موسم آ گیا تھا۔

یعنی مارچ ختم ہو رہا تھا۔ لارنس باغ میں سبزہ مہک دینے لگا تھا۔ درختوں سے چمٹی ہوئی بیلیں تروتازہ ہو گئی تھیں۔ اور ان کے ہرے ہرے نوزائیدہ پتے نکل آئے تھے۔ درختوں نے خزاں کا زرد لباس اتار کر بہار کا رنگین لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ سبزے کی کیاریوں کے عقب میں کھڑی قد آدم جھاڑیوں میں سویٹ پیز کے لال قرمزی' نیلے' گلابی اور سفید سفید پھول کھل گئے تھے۔ ان کے قریب سے گذرنے پر خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا تھا۔ ہوا طرح طرح کے پھولوں کی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ گہرے نیلے چمکیلے آسمان کے نیچے باغ کی شفاف فضا میں بھونرے اور تتلیاں ادھر سے ادھر اڑ کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ آم کے درختوں پر بور آ گیا تھا اور ان کی پتوں بھری ٹہنیوں پر سے رس ٹپکنے لگا تھا۔ دھرتی کے خزاں زدہ جسم میں بہار کا گرم شگفتہ اور زندگی سے بھرپور خون دوڑ گیا تھا۔ مال روڈ اور میکلوڈ روڈ کے کنارے والے درختوں نے ہرے بھرے نازک اور دھلے دھلائے اجلے پتوں کا چولا پہن لیا تھا۔

سمن آباد کی کوٹھیوں کے لگنوں میں سبزے میں جان پڑ گئی تھی۔ رنگ برنگ پھول صحن کی دیواروں کے اوپر سے سر نکالے سڑک پر آنے جانے والوں کو محبت اور پیار کا سندیسہ دے رہے تھے۔ جو پتنگیں سردیوں میں پت جھڑ سے درختوں کی بے برگ ٹہنیوں میں الجھ کر لٹکنے لگی تھیں اب وہ نو دمیدہ پتوں میں اس بری طرح پھنس گئی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا کاریگر بھی انہیں صحیح و سالم باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ جس جگہ کوئی سوکھا تنکا بھی پڑا تھا اب وہاں سے گھاس کا خوشہ پھوٹ پڑا تھا۔ دھوپ میں بیٹھنے سے اب گرمی محسوس ہوتی تھی اور چھاؤں میں ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا اور گرم ہوا کر چلتی تھی اور اپنی جھولیوں میں پھولوں' سبزے اور درختوں کے پتوں کی خوشبو بھر بھر کر لاتی تھی۔ ناشپاتی کے جن پیڑوں پر ذرا پہلے پھول آ گئے تھے۔ ان کی ٹہنیاں اب پتوں سے بھر گئی تھیں اور ان میں چھوٹی چھوٹی ناشپاتیاں لٹکنے لگی تھیں۔ بعضے درختوں پر ابھی تک گلابی اور سفید پھول کھل رہے تھے۔ یہی حال آڑو اور

آلوچے کے درختوں کا تھا۔ لوکاٹ کے درختوں کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ ان کے مرجھائے ہوئے لامبے پتے بالکل نیچے کو جھک گئے تھے۔ اور ان کی جگہ تازہ اور ہلکے سبز نئے پتے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح تن کر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ ناہایں۔ سیپیا رنگ کی چھوٹی چھوٹی پتیوں سے لد گئی تھیں اور ان کی چھاؤں میں جھڑے ہوئے پتے جو کبھی براؤن تھے اب گل سڑ کر سیاہ ہو گئے تھے۔ پیپل کے نئے نویلے نکھروں والے دمدار پتوں کو دیکھ کر چہرہ خوشی سے سرخ ہو جاتا تھا اور دل پھیل کر سینے سے باہر آنے کو تڑپنے لگتا تھا۔ کسی پتے کا رنگ ہلکا گلابی تھا تو کسی کا ہلکا سبز۔ کوئی پورا سبز ہو کر پوری طرح جوان ہو چکا تھا۔ کوئی ابھی اپنی ڈالی پر مروڑی بنا پڑا تھا۔ اور کوئی بہار کی خوشبودار گرم ہوا کے جادو کے اثر سے آہستہ آہستہ اپنی تہہ کھول رہا تھا۔ ذرا سی ہوا چلتی تو یہ سارے پتے مل کر تالیاں بجانے لگتے۔ جیسے نیچے سے بہار کی شہزادی کا جلوس گذر رہا ہو۔

ساری فضا مسرت اور خوشی کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ لیکن زیتون اپنی سہیلی شاہدہ کی سمن آباد والی کوٹھی کے دیوان خانے میں اداس بیٹھی تھی۔ وہ کروشیئے کی مدد سے اپنے ایک سفید دوپٹے کو گلابی لیس لگا رہی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ بڑے انہماک سے کام کر رہی تھی۔ کھلی کھڑکی کا پردہ چنا ہوا تھا۔ جالی میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ صبح صبح گھر آئی تھی اور غسل کرنے کے بعد اب ساتھ والے کمرے میں پلنگ پر بے سدھ ہو کر سو رہی تھی۔ نوکرانی دوسری طرف والے آنگن کے برآمدے میں بیٹھی کچنار صاف کر کے چنگیر میں ڈال رہی تھی۔ باہر والی سڑک خالی تھی۔ کوئی بس گذر جاتی تو ہلکا ہلکا گرد ہوا کی لہروں کے ساتھ اڑ کر کھڑکی کی طرف آتا دکھائی دیتا۔ سامنے والی کوٹھی کے لان میں کوئی بچہ تین پہیوں والی سائیکل چلا رہا تھا۔ سائیکل کے پہیوں کی چرخ چوں صاف سنائی دے رہی تھی۔ کسی وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے چلچلاتی دوپہر میں کسی گاؤں کے پاس کوئی رہٹ چل رہا ہے۔ یہ آواز بڑی اداس کر دینے والی تھی۔ زیتون ویسے ہی غمگین تھی۔ دو تین ماہ تک مسلسل نوکری کی تلاش کے بعد وہ ناامید ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے کسی جگہ ڈھب کی نوکری نہ ملی تھی۔ دو ایک جگہوں پر اسے نوکری کی پیش کش کی بھی گئی لیکن ایک تو تنخواہ اتنی کم تھی کہ بمشکل اس کے بسوں کا خرچ پورا ہوتا تھا۔ دوسرے کام بھی نیم خادماؤں ایسا تھا۔ اس کام کا اسے پہلے ہی بڑا تلخ تجربہ تھا۔ اور پھر وہ معمولی پڑھی لکھی تھی۔

یعنی صرف اردو پڑھ اور ٹوٹا پھوٹا لکھ ہی سکتی تھی۔

اس دوران میں زیتون کو سڑکوں، فٹ پاتھوں، بس سٹاپوں اور دفتروں اور سکولوں کی ڈیوڑھیوں میں کئی ایسے لوگ ملے جنھوں نے اس سے دوستی پیدا کرنی چاہی۔ اسے اچھی اچھی نوکریوں کا لالچ دیا۔ اسے فلم کمپنی میں شامل ہو کر ہیروئین بننے کے سبز باغ دکھائے مگر زیتون نے کسی کی طرف دھیان نہ دیا۔ کیونکہ وہ ان خارزاروں اور نوکیلے پتھروں سے اٹے ہوئے راستوں کی ٹھوکریں کھا کر اس حال تک پہنچی تھی۔ وہ تو اب شادی کے نام سے کانپ اٹھتی تھی۔ اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اس سے جو بھی شادی کرے گا وہ یا تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھوں فروخت کر دے گا اور یا کچھ عرصے کے بعد اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال باہر کرے گا۔ اس کے باوجود وہ شادی کر کے اپنی باقی ماندہ زندگی ایک شریف گھریلو عورت کی طرح بسر کرنا چاہتی تھی۔ مگر کیسے؟ کیونکر؟ یہ وہ سوال تھا جس کا زیتون کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دنیا اسے سوائے داشتہ یا رنڈی کے اور کسی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھی اور زیتون اپنی اس حیثیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فراموش کر دینا چاہتی تھی، نوکری اسے نہیں مل رہی تھی۔ اگر ملتی بھی تھی تو ایسی کہ جس میں صرف تنخواہ ہی کم نہیں تھی بلکہ اس کی عزت بھی محفوظ نہیں تھی۔ پھر وہ سوچتی کہ فرض کر لیا کہ اسے اچھی سی نوکری مل بھی جاتی ہے۔ تو وہ کیا ساری عمر نوکری ہی کرتی رہے گی؟ کیا وہ دن اس کی زندگی میں کبھی طلوع نہیں ہو گا۔ جب اس کی گود میں اس کا چاند سا بچہ کھیل رہا ہوگا۔ اور اس کا خاوند اس پر جھکا بچے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہو گا؟ ابھی اس کی جوانی کا عروج تھا۔ ابھی تو وہ اپنی جوانی اور جسم کی تازگی سے اپنا ہونے والا خاوند تلاش کر سکتی تھی۔ پانچ چھ سال بعد جب اس کا بدن ڈھلنا شروع ہو جائے گا۔ کنپٹیوں پر ایک آدھ سفید بال نمودار ہو جائے گا۔ اور رخساروں کی شگفتگی سوکھنے لگے گی تو پھر وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ پھر تو شاید وہ بچہ بھی پیدا کرنے کے لائق نہ رہے گی۔ پھر تو اس سے کوئی بھی شادی کرنے پر تیار نہ ہو گا۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ ابھی سورج پوری طرح مغرب میں غروب نہیں ہوا تھا۔ زیتون اس روشنی میں شام ہونے سے پہلے پہلے، اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اپنی زندگی کی منزل کو پا لینا چاہتی تھی۔

اور یہ منزل بڑی سیدھی سادی اور آسان تھی۔ یعنی ایک چھوٹا سا گھر۔ چولہا

کچھ برتن۔ ایک خاوند اور صحن میں کاغذ کے ٹکڑوں سے کھیلتا ہوا بچہ------! مگر یہ سیدھی اور آسان منزل اتنی دشوار گذار اور طویل اور پر پیچ ہو گئی تھی کہ زیتون کے تلوؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ اور تھکن سے چہرہ مرجھا گیا تھا۔

وہ دو تین روز سے شاہدہ کے ہاں پڑی تھی۔ شاہدہ اس کا سارا بوجھ اٹھا رہی تھی۔ اس کا طرز عمل زیتون سے بڑا اچھا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ زیتون کو اپنی ڈگر پر چلانے کے لیے دو ایک بار کوشش کر چکی تھی۔ اور زیتون نے بڑی شائستگی سے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ لیکن شاہدہ نے اسے مجبور بالکل نہیں کیا تھا۔ مثلاً ایک رات شاہدہ کاایک کارخانے دار دوست اس کے گھر آ گیا۔ اس نے رات وہیں گذاری۔ شاہدہ نے اس سے زیتون کا تعارف کروایا۔ کارخانے دار کا رنگ لوہے کی طرح سانولا تھا۔ بال موٹے تھے۔ اور توند بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بے طرح کھا رہا تھا اور بے تکی باتیں کئے جا رہا تھا۔ بار بار سگریٹ پیتا اور بار بار تھوکتا تھا۔ وہ لکھ پتی تھا۔ اور چھ بچوں کا باپ اور دو بیویوں کا خاوند تھا۔ اس نے زیتون کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"خدا بری نظر سے بچائے آپ کی سہیلی تو بڑی خوبصورت ہے۔"

زیتون کے نزدیک اس جملے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس قسم کے کئی جملے، ایسے لوگوں سے سن چکی تھی جو صرف رات کی رات اس پر عاشق ہو کر صبح اسے بھول جایا کرتے تھے۔ زیتون نے اپنا بازو کھینچ لیا۔ وہ سمٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ دراصل شاہدہ بھی یہی چاہتی تھی کہ زیتون اس کے ساتھ مل کر کام کرے اور یوں اس کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ وہ ایک انتہائی قیمتی اور جوان عورت کو گھر میں یونہی بیکار بیٹھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن وہ خود اسے مجبور کرنا چاہتی تھی۔ کارخانے دار نے مشروب سے بھرا ہوا گلاس زیتون کی طرف بڑھایا۔ مگر زیتون نے پینے سے انکار کر دیا۔ اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شاہدہ اپنے دوست کے ساتھ تنہا کمرے میں میٹھی باتیں کرتی رہی۔ زیتون پلنگ پر لحاف اوڑھ کر نیم دراز ہو گئی۔ اور ایک فلمی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ سردی بہت تھی اور رات بھی کافی گذر گئی تھی۔ اسے ساتھ والے کمرے سے کبھی کبھی شاہدہ کے قہقہے کی آواز، گلاس کی جھنکار اور بے ہنگم ہنسی کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ زیتون کے دل میں اس قسم کی ننگی اور بے حیا آواز ایک پل کے لیے بھی

ہلچل پیدا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اس سمندر کی موجوں میں اچھی طرح تیر چکی تھی۔ وہ اس پر ہوس کے شہر کی گلی کوچوں کی جی بھر کر سیر کر چکی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے رسالہ پڑھتی رہی۔ اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتی رہی، وہ شاہدہ کی زندگی پر سوائے افسوس کے اظہار کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی زندگی کا انجام خوفناک ہو گا۔ پھر وہ نہ گھر کی رہے گی اور نہ گھاٹ کی-----مگر شاہدہ اپنی ڈگر پر اتنی آگے جا چکی تھی کہ زیتون کی آوازیں اس تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔ زیتون کو نیند آنے لگی۔ اس نے ٹیبل لیمپ کی بتی گل کی اور منہ لحاف کے اندر کے کر سو گئی۔

جانے رات کا کیا عمل ہو گا کہ زیتون کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے گال پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اسے اپنے چہرے پر کسی کا بدبودار بوجھل سانس محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ اس کے سامنے بھدا کارخانے دار پلنگ پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھی۔ اور سر کے موٹے بال سرکنڈوں کی طرح کھڑے تھے۔

"آپ یہاں سے چلے جائیں"۔

کارخانے دار نے چٹکی سے سگریٹ کا گل جھاڑ کر جھولتے ہوئے کہا۔

"میری جان ہم تو تیرے عاشق ہیں عاشق"۔

زیتون نے غصے میں کہا۔

"میں شور مچا دوں گی۔"

کارخانے دار نے قہقہہ لگایا۔

"شور مچا کر اپنا ہی نقصان کرو گی۔ ہمارا کیا جائے گا۔ ساتھ والے کمرے میں اس گھر کی مالکہ سو رہی ہے۔ اس نے مجھے اجازت دے دی ہے۔"

زیتون نے پلنگ پر سے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر کارخانے دار نے اسے پکڑ کر گرا لیا اور پھر تھپڑ مار کر غرایا۔

"حرامزادی! رنڈی ہو کر شریف عورتوں کا روپ بھرتی ہے۔ کتیا! تو جس آدمی کے گھر سے بھاگی ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ اس کے غنڈے اس شہر کے کونے کونے میں تجھے تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے ذرا اسے اطلاع کر دی تو وہ ایک منٹ میں تجھے

یہاں سے گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ اور ایسی کوٹھڑی میں بند کر دیں گے جہاں سے تو ساری زندگی باہر نہ نکل سکے گی۔ بول اب کیا چاہتی ہے؟"

زیتون کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی ساری طاقت اسے جواب دے گئی۔ اس کے حلق میں آواز دب کر رہ گئی۔ وہ حیران ہو گئی کہ اس کارخانے دار کو اس کی پچھلی زندگی کے واقعات کا کیونکر علم ہوا۔ کیا شاہدہ نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا؟ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا خبر نشے میں وہ سب کچھ بک گئی ہو! تو کیا اس کی تلاش میں غنڈے پھر رہے ہیں۔ کیا وہ اسے پکڑ کر عمر بھر کے لیے کالی کوٹھڑی میں پھینک دیں گے؟ نہیں نہیں وہ۔ شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے۔ جس کا ایک چھوٹا سا کچا آنگن ہو۔ چولہا ہو۔ اور ایک معصوم بچہ کاغذ کے ٹکڑوں سے کھیل رہا ہو۔

پچھلی زندگی کے ہولناک واقعات اس کی آنکھوں میں پھر گئے۔ وہ جگہ جگہ ماری ماری پھرنے' ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں میدے کی بوری کی طرح بکنے اور ہر ہوس کار کی ہوس کا نشانہ بننے سے اس بھدے کارخانے دار کی آغوش کو ترجیح دیتی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ ان غنڈوں کے ہاتھ لگ گئی جو اسے جگہ جگہ لیے پھرتے تھے۔ تو وہ اسے مار مار کر لہولہان کر دیں گے۔ اور پھر وہ ساری عمر ان کے پنجے سے باہر نہ نکل سکے گی۔ چنانچہ زیتون نے اپنا آپ کارخانے دار کے حوالے کر دیا۔

دوسرے روز زیتون بیمار پڑ گئی۔ اور دو روز بیمار رہی۔ شاہدہ نے اس کی ہر طرح سے تیمارداری کی۔ جب زیتون نے اس سے گلہ کیا کہ اس نے کارخانے دار کو اس کی گذشتہ زندگی سے آگاہ کیوں کیا تو شاہدہ نے اس کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"زیتون! میں تمہاری مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ اس روز میں نے اتنی پی لی تھی کہ مجھے اپنا ہی ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ مجھ سے جو کچھ پوچھتا گیا میں اسے بتاتی چلی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے تمہاری گذشتہ زندگی کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ لیکن یقین کرو میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنے کیے پر بے حد ندامت ہوئی۔ اب میں تم سے معافی مانگتی ہوں"۔

زیتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دوپٹے سے پلکیں پونچھ کر کہا۔

"اگر اس نے کسی کو بتا دیا تو میری ساری زندگی جہنم بن جائے گی۔ اور میری ساری آرزوئیں خاک میں مل جائیں گی"

شاہدہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"اس کا میں ذمہ لیتی ہوں کہ وہ اس سلسلے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔ تم نہیں جانتی وہ میرے جسم کا دیوانہ ہے اور میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ مجھے ناراض کرنا کبھی گوارا کر ہی نہیں سکتا۔ میں نے اسے منع کر دیا ہے اور وہ کبھی کسی سے بات نہیں کرے گا۔ تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔ یہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو"۔

"اب مجھے کچھ حوصلہ ہوا ہے شاہدہ"۔

شاہدہ نے آگے بڑھ کر زیتون کا ماتھا چوم لیا۔

"میری بہن! تم ہر قسم کا خوف دل سے نکال کر رہو۔ اور ہنسی خوشی رہو۔ اب میں تمہیں اپنی ڈگر پر چلنے کے لیے بھی کبھی نہ کہوں گی۔ میں سمجھتی ہوں تم نے اپنے لیے جو راستہ چنا ہے وہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ جس طرح کہ میرا راستہ میرے لیے بہتر ہے۔"

اچانک ایک بس تیزی سے گذری اور زیتون کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سڑک پر گرد اڑی اور پھر کھڑکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ سامنے والی کھڑکی میں اب تین پہیوں والی سائیکل کی چرخ چوں بند ہو گئی تھی۔ شاہدہ سو کر اٹھ بیٹھی تھی اور باہر دالان میں نوکرانی سالن میں مرچیں کم ڈالنے کی ہدایات دے رہی تھی۔ پھر وہ دیوان خانے میں آ گئی۔ اور زیتون سے باتیں کرتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ سے بالوں کو سنوارنے لگی۔ زیتون کے ذہن میں خیالات کا سمندر موجزن تھا۔ وہ آج اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ شاہدہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہی۔ پھر اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ زیتون نے گہرا سانس لیا اور کروشیا اور دوپٹہ ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے سر صوفے کی پشت سے لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

سامنے والی کوٹھی کی دیوار کے اوپر سے سویٹ پیز کچھ گلابی اور کاسنی پھول اپنے سر اٹھائے بڑے پیار سے زیتون کو دیکھ رہے تھے اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ گہرے نیلے آسمان پر سفید بادلوں کے کچھ ٹکڑے بڑی

ست روی سے مشرق سے مغرب کی جانب رواں تھے۔ ایک لڑکا سائیکل پر سوار بلند آواز میں کسی فلمی گیت کا مصرعہ الاپتا سڑک پر سے گزر گیا۔ شیشم کی پھننگ پر بیٹھی ہوئی ایک چیل بڑے اداس سے لہجے میں چیخی اور اڑ گئی۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اندر آیا اور کھڑکی کے پہلو میں تنا ہوا پردہ ذرا سا لہرا کر پھر ساکت ہو گیا۔ اچانک زیتون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر کسی نئی امنگ اور نئی امید کی روشنی تھی۔ اس کی ساری اداسی اور پژمردگی دور ہو چکی تھی۔ اس نے صوفے پر سے اٹھ کر دوپٹہ پرے کیا۔ سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو کر آئینے میں جھانک کر اپنا چہرہ دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی۔ سر پر دوپٹہ درست کیا اور باہر دالان میں سے ہو کر باورچی خانے میں چلی گئی اور شاہدہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں اس رات کبیر سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کبیر بقول خود رات بارہ بجے کے بعد گھر پر مل سکتا تھا۔ اور زیتون اکیلی بارہ بجے رات کو سمن آباد سے نہیں نکل سکتی تھی۔ ویسے تو وہ کسی وقت بھی وہاں سے جا سکتی تھی۔ مگر شاہدہ سے وہ کہہ کر جائے؟ ظاہر ہے اگر وہ فلم کا دوسرا شو دیکھنے چلی جائے اور رات بارہ بجے کے بعد کبیر کو اس کے گھر پر جا ملے تو پھر اسے رات وہیں گزارنا پڑے گی۔ دو تین بجے رات کو اکیلی واپس سمن آباد نہیں آ سکتی۔ پھر وہ شاہدہ سے کیا بہانہ بنائے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اور رات کہاں رہے گی؟ اور اگر وہ دن ہوتے میں کبیر کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تو اس کا ملنا محال ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ پھر وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کہاں بیٹھتا ہے اور دن کو کہاں کہاں ہوتا ہے؟ زیتون کشمکش میں الجھ گئی۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کر چکی تھی کہ یہ چھوٹا سا مسئلہ اس کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کبیر کو رات بارہ بجے کے بعد ہی ملنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اور شاہدہ کو وہ کہہ لے گی کہ سینما سے رات دیر ہو گئی۔ کوئی سواری نہ ملی اور وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں شہر میں ہی جا کر سو گئی۔ کیونکہ شاہدہ کو معلوم ہے کہ شہر میں زیتون کی دو ایک پرانی سہیلیاں رہتی ہیں اگرچہ زیتون انہیں برسوں سے کبھی نہیں ملی۔

(۶)

کبیر ایک گاؤں کی سیر کو چل نکلا۔

بات یہ ہوئی کہ سیالکوٹ کے ضلع میں کبیر کا ایک یار چھوٹی موٹی زمینداری کرتا تھا۔ اس نے کبیر کو دعوت دی کہ وہ کچھ روز اس کے پاس گاؤں آ کر گزار جائے کبیر کو اپنی شب و روز کی آوارہ گردی سے کبھی اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ وہ اس قسم کے بے معنی دورے کیا کرتا۔ لیکن ان دنوں اس کے قرض خواہوں کے تقاضے شدت اختیار کر گئے تھے۔ چنانچہ اس نے گاؤں کی سیروسیاحت سے اپنا اور قرض خواہوں کا دل بہلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس گاؤں کا نام ماہی منڈا تھا۔ کبیر کو بڑا دلچسپ نام لگا۔ یہ گاؤں ریلوے لائن سے کافی دور تھا۔ کبیر کے زمیندار یار نے جس کا نام خدا بخش پردیسی تھا۔ کبیر کو سفر کی تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ کبیر ایک دن منہ اندھیرے ہی سردی میں ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان دنوں بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اور ابھی بہار کا موسم نہیں آیا تھا۔ اس زمانے میں زیتون ابھی نوکریوں کی تلاش کے چکر میں تھی اور کبیر سے اس کی دوسری ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔

ماہی منڈا نامی گاؤں کے لیے صبح صبح لاہور سے ایک ریل کار یعنی ڈبہ جاتا تھا۔ جو پسرور نامی سٹیشن پر جا کر رک جاتا تھا۔ یہاں سے ایک تانگے پر بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے ماہی منڈا جانا پڑتا تھا۔ سخت سردی میں کبیر پلیٹ فارم نمبر ۴ پر آ گیا۔ ڈبہ کھڑا تھا اور اس میں دیہاتی لوگ ٹھنسے ہوئے تھے۔ ابھی اس کے چلنے میں کوئی بیس منٹ رہتے تھے۔ کبیر نہار کلیجہ گھر سے چلا تھا۔ ویسے بھی اسے ناشتہ بنا کر دینے والا کون تھا؟ وہ ایک ٹی سٹال پر جا کر کھڑا ہو گیا اور چائے کی پیالی بنوا کر چسکیاں لینے لگا۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا اور پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ جو پچھلے پہر کی میٹھی نیند کو چھوڑ کر مجبوراً وہاں آئے تھے۔ اور بوجھل آنکھیں اور ستے ہوئے چہرے لیے پھر رہے تھے۔ اس نے سوچا آخر ان لوگوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنی سویرے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ آدمی تو اتنی سویرے یا تو محض سیر کے لیے گھر

سے نکلنا چاہیے اور یہ یا کسی انتہائی خوبصورت لڑکی کو ملنے کے لیے ----۔ اس کے علاوہ دنیا کا کوئی کام اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کے لیے آدمی اپنی میٹھی نیند کے سر پر جوتا مارے۔

مسافروں کی زیادہ تعداد دیہاتیوں کی تھی۔ ان میں کچھ تو نہروں ' پلوں اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور تھے۔ اور چند ایک بابو لوگ تھے یعنی دیہاتی بابو جو کسی کام سے لاہور آئے تھے۔ اور اب اپنے مضافاتی دفتروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ اس ڈبے میں رش اس لیے زیادہ ہوتا تھا کیونکہ یہ ڈبہ دفتر کے ٹھیک وقت پر شہر پسرور پہنچ جاتا تھا۔ کبیر حیران تھا کہ یا تو ڈبے میں اتنا رش ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں اور دوسرے اتنا ہی ہجوم باہر پلیٹ فارم پر میلی میلی چادروں اور پرانے کھیسوں میں لپٹا پڑا ہے۔ جب اس ڈبے کے ساتھ ایک خالی ڈبہ آگر نتھی ہوا تو کبیر کو اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔

ہجوم ہما کر اس خالی ڈبے پر ٹوٹ پڑا۔ کبیر بڑے اطمینان سے سٹال کے ساتھ لگا چائے پیتا رہا اور ان گندے مندے دیہاتی لوگوں کو جانوروں کی طرح ڈبے کے دروازے میں سے اندر گھستے دیکھتا رہا۔ کھڑکیوں پر لمبے لمبے شیشے چڑھے تھے۔ اندر بتیاں روشن تھیں اور شیشوں کے پیچھے سے دیہاتیوں کے زرد زرد حیران چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کبیر نے سوچا کیوں نہ یہاں سے واپس گھر جاکر آرام سے لحاف اوڑھ کر سویا جائے؟ آخر ماہی منڈا گاؤں میں سوائے گردوغبار اور سردی کے اور کیا ہو گا؟ لیکن وہاں ایک بات بالکل نہیں تھی۔ یعنی کبیر سے اپنا قرض واپس مانگنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور جہاں قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو وہاں کا موسم لاجواب ہوتا ہے اور پھول پوری شان سے کھلتے ہیں اور درختوں پر طائران خوش الحان رات رات بھر نغمہ ریزی کرتے ہیں۔ کبیر نے واپس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ڈبے میں سوار کیونکر ہوا جائے۔ سب دروازوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔

جب سیٹی بجی اور ڈبے نے وسل دیا تو کبیر بھی دروازے میں کھڑے ہجوم میں شریک ہو گیا۔ ڈبہ چل پڑا۔ پلیٹ فارم پیچھے کھسکنے لگا۔ ڈبے نے رفتار تیز کر لی اور دیکھتے دیکھتے فیض باغ والا ایک موریہ پل اور پھر مصری شاہ اور پھر فاروق گنج کی آبادی گذر گئی۔ جب سرد ہوا کے تھپیڑے تیز ہو گئے۔ تو اندر والے لوگوں نے چیخنا شروع

کر دیا۔

"دروازے بند کرو۔ دروازے بند کرو۔"

حالانکہ باہر کھڑے لوگوں کو سردی سے پورا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ بادامی باغ کا سٹیشن گذرا تو سردی سے کبیر کی ناک ٹھٹھر گئی۔ جسم کا باقی حصہ اس نے اپنے تاریخی اوورکوٹ میں لپیٹ رکھا تھا۔ ماتھا سنگ مرمر کا ٹکرا بن گیا۔ لوگوں کے ساتھ کھسکتا کھسکتا وہ بھی ڈبے کے اندر پہنچ گیا۔ اب ڈبے کا دروازہ بند کر دیا گیا اور لوگ ایک دوسرے کی پسلیوں میں گھس کر بیٹھ گئے یا کھڑے رہے۔ بند ڈبے کی فضا گرم تھی اور ایسی بدبو سے بوجھل تھی جو عام طور پر گھوڑوں کے اصطبل سے اٹھا کرتی ہے۔ ایک دیہاتی بابو نے ناک پر رومال رکھ لیا۔ کبیر نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی' کیونکہ ایک تو وہ دنیا کی کسی بھی بدبو کی بدبو نہ سمجھتا تھا۔ دوسرے اسے معلوم تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد یہ بدبو ختم ہو جائے گی یا اس کی ناک عادی ہو جائے گی۔ اور ہوا بھی یہی۔ دو تین سٹیشن گذرے تو ڈبے سے بدبو غائب تھی۔ یہ تھی تو کبیر کو اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا اب وہ خود اس بدبو کا حصہ بن گیا تھا جو اس کے معاشرے کا ایک حصہ تھی۔

نارووال کے سٹیشن پر ڈبہ رکا تو بے شمار سواریاں اتر گئیں۔ ڈبہ تقریباً خالی ہو گیا۔ کبیر بڑے آرام سے ایک گدے دار نشست پر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ سورج کی روشنی میں کھیتوں کا منظر اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ڈبہ نارووال سے روانہ ہو گیا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مگر دھند اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ دھوپ کی کہیں ایک کرن بھی نہیں چمک رہی تھی۔ صرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھیت نظر آ رہے تھے۔ لائن کے ساتھ ساتھ لگے شیشم کے درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے اور ٹنڈ منڈ ٹہنیاں شبنم میں بھیگی کھڑی تھیں۔

پسرور کے سٹیشن پر ڈبہ رکا تو کبیر اتر پڑا۔

پکی اینٹوں والا بینگا ٹیڑھا پلیٹ فارم۔ ڈبے کے انجن میں سے باہر نکلتا ہوا نیلی وردی والا فائرمین۔ ایک طرف جنگلے سے لگ کر بیٹھی ہوئی کچھ دیہاتی عورتیں پھٹی پھٹی آنکھوں والی ایک پاگل فقیرنی۔ ٹکٹ چیکر کی لات کھا کر بھاگتا ہوا ایک خارش زدہ کتا۔ ٹنڈ منڈ درخت۔ گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دیہاتی لوگ اور بس-----

یہ تھا پسرور کا اسٹیشن!

کبیر ٹکٹ دے کر گیٹ سے باہر نکل آیا۔ باہر پرانی وضع کے بے رنگ تانگے اور اسی قسم کے چالاک دیہاتی کوچوان سانٹے بغل میں دبائے کھڑے تھے۔ اور چیخ و پکار سے سواریوں کو اپنی طرف بلا رہے تھے۔

"چلو پل ایک سواری"۔

" سلانفن پر کوئی سواری"۔

"گلاس والے۔ گلاس والے"۔

کبیر ایک ریڑھی والے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چونی کے چار سنگترے لیے اور انہیں چھیل کر کھانے لگا اور کوچوانوں کی آوازوں کا جائزہ لینے لگا۔ پل ۔ سلانفن اور گلاس والے کی آوازیں ابھی لگا رہے تھے۔ مگر "ماہی منڈا" کی آواز کوئی نہیں دے رہا تھا۔ کبیر نے ایک پل کے لیے سوچا کہ کہیں وہ کسی غلط سٹیشن پر تو نہیں اتر پڑا۔ لیکن نہیں سٹیشن کی پیشانی پر "پسرور" لکھا تھا۔ پسرور۔ جہاں کی ہانڈیاں بہت مشہور ہیں۔ اس شہر کو مشہور ہونے کے لیے ہانڈیاں ہی رہ گئی تھیں؟ یقیناً یہاں کی ہانڈیاں نازک ' دیرپا ' اور کشادہ ہوں گی۔ کیا ہانڈیاں کے علاوہ یہاں کی کوئی اور شے نازک ' دیرپا اور کشادہ نہیں ہوتی؟

"باؤ جی کہاں جانا ہے؟"

ایک تہمد پوش کوچوان نے کبیر کے پاس آ کر پوچھا۔ کبیر نے سنگترہ اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

"سنگترہ کھاؤ گے؟"

کوچوان شرمندہ سا ہو گیا اور کہنے لگا۔

"باؤ جی بسم اللہ کرو"

کبیر نے پوچھا۔

"ماہی منڈا کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"یہی کوئی دس گیارہ میل"۔

"دو گھنٹے تو ضرور لگ جائیں گے باؤ جی"۔

کیا لو گے؟

"سواری یا سالم؟"

"سالم"۔

"آپ سے پانچ روپے لے لوں گا باؤ جی"۔

کبیر نے سنگترہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"سنگترہ کھاؤ یار اور لعنت بھیجو ماہی منڈا کو ۔ تمہیں پانچ دینے کی بجائے میں دو روپے خرچ کر کے واپس لاہور ہی کیوں نہ چلا جاؤں؟" لو سنگترہ کھاؤ

کوچوان بھی بڑا کایاں تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ باؤ جی واپس لاہور نہیں جا سکتے اور ماہی منڈا گاؤں ضرور جائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے پانچ روپے نہ دیں۔ چنانچہ اس نے سنگترے کی ایک پھانک اٹھا کر کہا۔

"دو چار آنے کم دے دیں باؤ جی ۔ آپ سے ہمیں کیا کمانا ہے۔"

کبیر بھی کوچوان سے کم نہ تھا۔ بلکہ ذہنی اعتبار سے وہ کوچوان کی سطح سے بھی نیچے آ سکتا تھا۔ وہ کوچوان کو بار بار یہی کہتا رہا کہ اب وہ لاہور ہی واپس جائے گا اور اس سے گاڑیوں کے مختلف اوقات دریافت کرنے لگا۔ کوچوان کچھ ناامید ہو گیا۔ اسے کچھ کچھ یقین ہو گیا کہ مسافر واقعی واپس جا رہا ہے۔ شکار ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ چنانچہ وہ تین روپوں پر ماہی منڈا چلنے پر راضی ہو گیا۔ کوچوان ادھیڑ عمر کا تھا اور علیا اس کا نام تھا۔

اس کا تانگہ کھڑ کھڑ کر کے چلتا تھا۔ بظاہر اس کا پنجر ڈھیلا تھا مگر اس کے اندر بڑے سے بڑے گڑھے میں گر کر باہر نکل آنے کی طاقت موجود تھی۔ کبیر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا اور تانگہ "ماہی منڈا" گاؤں کی طرف چل پڑا۔ سٹیشن سے ایک تنگ سی سڑک موڑ گھوم کر پسرور کے شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ شہر پرانا تھا۔ کائی لگی دیواروں والے ہندوؤں اور سکھوں کے اونچے اونچے ' جھکے جھکے جالی دار چھجوں والے مکان کھڑے تھے۔ شہر کا ایک بوسیدہ سا دروازہ بھی تھا۔ جس کے اندر اکھڑے ہوئے فرش والی سڑک اوپر کو اٹھتی چلی گئی تھی۔ تانگہ شہر کی دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ سامنے سڑک پر ٹوکروں اور چادروں میں مولیوں ' گاجروں ' ٹماٹروں اور سبزیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ اور دیہاتی ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے انگلیاں دبا کر سودے بازی کر رہے تھے۔ یہ انگلیاں دبا کر سودا کرنے کا طریقہ بھی بڑا اچھا ہے۔ کسی زمانے میں عورتوں کے سودے بھی اسی طرح ہوا کرتے تھے۔ ذرا انگلی دبائی اور عورت کو اٹھا کندھے پر ڈال کر گھر لے گئے۔ جس طرح یہ دیہاتی اب گاجروں کا گٹھڑا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ عورت کی حیثیت اس دور میں بھی گاجر سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر

عورت میٹھی نکل آئے تو مرد اسے بڑے مزے لے لے کر کھاتا ہے اور اس کی کیل بھی کھا جاتا ہے لیکن اگر پھیکی یا بدمزہ ہو تو اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیتا ہے۔

ایک عورت نے کھڑکی میں سے کوڑے کا کنستر باہر گلی میں الٹ دیا اور گرد کا ایک غبار اٹھا اور آہستہ آہستہ پسرور شہر کے گلی کوچوں کی چہل قدمی کے لیے چل نکلا۔ تانگہ ایک گندے جوہڑ کے ٹوٹے ہوئے پل کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ جوہڑ کے بدبودار غلیظ پانی میں چند ایک بدصورت بطخیں تیر رہی تھیں۔ ایک بطخ نے گردن اٹھا کر کبیر کی طرف دیکھا اور دوسری کے کان میں کچھ کہا۔ دوسری نے تیسری سے کچھ کہا اور دوسرے لمحے بطخوں کی ساری ٹولی گردنیں اٹھا کر کبیر کو دیکھ رہی تھیں اور قیں قیں کا شور مچا رہی تھیں۔

تانگہ پسرور شہر کو پیچھے چھوڑ کر کھلے کھیتوں کے بیچوں بیچ سڑک پر جا رہا تھا۔ سڑک پکی تھی اور تارکول کی بنی ہوئی تھی۔ کبیر بڑا خوش ہوا کہ سفر بڑے آرام سے کٹے گا۔ اس نے کوچوان سے پوچھا۔

"ماہی منڈا تک سڑک ایسی ہی پکی ہے ناں؟"

کوچوان نے جو تانگے کے بانس پر کمبل اوڑھے اکڑوں بیٹھا تھا کہا۔

"تھوڑا سا ٹکڑا خراب آتا ہے۔"

کبیر کانپ گیا۔ وہ دیہاتی سڑکوں کے تھوڑے سے خراب ٹکڑوں سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن ابھی تو سڑک صاف تھی اور اب کھیتوں میں سے دھند بھی غائب ہو رہی تھی۔ اور گرم گرم چمکیلی دھوپ چمکنے لگی تھی۔ آسمان صاف ہو کر گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب ٹاہلی کے درخت کھڑے تھے۔ ہوا چل رہی تھی اور درختوں کی ٹہنیوں پر سے سوکھے پتے جھڑ جھڑ کر نیچے گر رہے تھے۔ سردی خوب تھی لیکن دھوپ نکل آنے سے اس کی شدت میں کچھ کمی ہو گئی تھی۔ کلاس والا قصبہ آیا تو وہاں کبیر نے ایک جانب آم کے درختوں کے جھنڈ دیکھے۔ کوچوان نے بتایا کہ آم کے یہ باغات ہندوؤں اور سکھوں کے لگائے ہوئے ہیں۔

"انہیں باؤ جی ان چیزوں کا بہت شوق ہوتا تھا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر سیر کو جاتے۔ باغ میں آ کر ورزش کرتے۔ جانوروں کو کھانے پینے کی چیزیں ڈالتے۔ اب توان کے لگائے ہوئے کتنے ہی باغ اجڑ گئے ہیں۔ ان کے ٹھیکے مسلمانوں کے پاس ہیں۔ مگر باؤ جی یہ لوگ روپیہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باغ کی دیکھ بھال ویسے

نہیں کر سکتے۔"

کبیر نے دیکھا۔ آم کا باغ واقعی کافی گنجان اور وسیع تھا۔ درختوں کے سائے میں گہرا گہرا سبز اندھیرا چھا رہا تھا۔ یہاں بھی ایک گندا جوہڑ ملا جس میں گندی مندی چونچوں والی بدصورت بطخیں تیر رہی تھیں۔ کبیر کا تانگہ اس قصبے کے بازاروں میں سے ہو کر گذر گیا۔ کچھ لوگوں نے اپنی بوسیدہ دوکانوں پر بیٹھے بیٹھے کبیر کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ ایک بارہ چودہ سال کی لڑکی پانی کی بالٹی اٹھائے تنگ سی گلی میں مڑ گئی۔ بالٹی کے بوجھ سے اس کا دبلا پتلا جسم ایک طرف کو کمان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ ابھی اس کمان سے تیر نکلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

اب سڑک بڑی خراب ہو گئی تھی اور تانگے کو بڑے دھچکے لگ رہے تھے۔ کبیر کا خیال تھا کہ تانگہ جس بری طرح سے خود اچھل کر اسے بھی اچھال رہا ہے۔ یہ بمشکل دو پھیرے اور لگا سکے گا۔ اور اس کا سارا ڈھانچہ کھل جائے گا۔ مگر کوچوان نے ہنس کر کہا۔

"باؤ جی میں تو دس سال سے اسی تانگے کو چلا رہا ہوں۔"

کبیر نے سوچا پھر اس کی سواریاں زندہ نہیں بچی ہوں گی۔ کیونکہ سڑک اتنی خراب تھی کہ تانگے اور سواری ان دونوں میں کسی نہ کسی کا کیفرکردار تک پہنچنا لازمی امر تھا۔ تانگہ اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا۔ بائیں جانب بڑی نہر شروع ہو گئی تھی۔ داہنی جانب ایک اور چھوٹا سا کچے مکانوں والا گاؤں آیا۔ کوچوان کبیر کو ہر ایک گاؤں کے بارے میں اپنی پوری معلومات بتاتا جا رہا تھا۔ آخر دور سے "ماہی منڈا" نامی گاؤں کے آثار دکھائی دینے لگے۔ چند ایک اونچے اونچے کائی زدہ حویلی نما مکان، پیپل کے درخت اور کچے مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں ـــــ! کچھ کتوں کے بھونکنے کی صدائیں اور ایک بھینس کے ڈکرانے کی آواز ـــــ گاؤں "ماہی منڈا" آ گیا تھا۔ کبیر کی منزل مقصود آ گئی تھی۔

"آ گیا باؤ جی "ماہی منڈا"۔"

تانگہ گاؤں کے باہر ایک درخت کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کبیر نے کہا

"یار مجھے خدا بخش پردیسی کے گھر جانا ہے۔"

"اچھا وہ پردیسی صاحب کے ہاں ـــ سمجھ گیا۔ وہ تو گاؤں سے باہر حویلی میں رہتے ہیں۔"

"بس وہاں لے چلو مجھے"۔

"فکر نہ کریں باؤ جی"۔

کوچوان نے گھوڑے کو ایک سانٹا مارا۔ گھوڑا زور سے اچھلا۔ اور بڑے آرام سے اپنی تکی بندھی چال پر پھر چل پڑا۔ گاؤں سے باہر ایک چھوٹی سی خشک نہر کے کنارے پیلے رنگ کا ایک اک منزلہ مکان نظر آیا۔ کوچوان نے اشارے سے کہا۔

"یہ ہے جی پردیسی صاحب کا مکان"۔

تانگہ پردیسی کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مکان کے باہر بیٹھے کچھ دیہاتی اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جس وقت تانگہ مکان کے باہر رکا تو کبیر نے دیکھا کہ پردیسی خود باہر آ رہا ہے۔ اس نے مسکرا کر کبیر کا خیرمقدم کیا۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے"۔

"کیوں؟"

"بادشاہ آدمی ہو"۔

"کبھی کبھی بادشاہ بھی سفر پر چل پڑتے ہیں"۔

کبیر نے تانگے والے کو تین روپے دیے تانگے والا سلام کر کے واپس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ خدا بخش پردیسی درمیانے قد اور درمیانے جسم کا سانولا سا دیہاتی سبھاؤ والا جوان تھا۔ جس نے شہر سے بی اے کیا تھا اور اب گاؤں میں اکیلا اپنی زمینداری کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہارا سامان کہاں ہے؟"

"لاہور میں"۔

پردیسی ہنس پڑا

"چلو اچھا کیا تم کچھ ساتھ نہیں لائے۔ وگرنہ وہ ضرور ریل ہی میں رہ جاتا اور مجھے ریلوے والوں کو درخواستیں بھیجنا پڑتیں"۔

اب دھوپ خوب پھیل گئی تھی اور دھند اس طرح غائب ہو چکی تھی جیسے کبھی پھیلی نہ ہو۔ کچے صحن میں چارپائی اور کرسیاں ڈال دی گئیں۔ کبیر نے اوورکوٹ اتار دیا۔ جوتے کھول دیے اور چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا برآمدے میں پانی سے بھرا ہوا جگ پڑا تھا۔

"منہ ہاتھ دھو لو"۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

پردیسی کے نوکروں نے اسی وقت کھانے پکانے کا کام شروع کر دیا۔ کبیر نے شیو بنائی اور باہر ایک گنا کھیت میں سے توڑ کر چوسنے لگا۔ اچانک مرغ کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پردیسی کا ایک لم تڑنگ لال لال آنکھوں والا نوکر کالے مرغ کو پکڑنے کی فکر میں دونوں بازو پھیلائے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کالا مرغ ادھر ادھر چکر کھاتا اپنی جان بچانے کی فکر میں واویلا مچا رہا تھا۔ شاید پولیس کو بلا رہا تھا۔ مگر کوئی اس کی مدد کو نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی زبان میں چلا رہا تھا۔

"بچاؤ۔ بچاؤ۔ یہ لوگ مجھے قتل کرنے لگے ہیں۔ میری مدد کرو مجھے ان قاتلوں سے بچا لو۔ پولیس! پولیس! پولیس! ککڑوں کڑوں"

مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگ رہی تھی۔ ایک دیہاتی سر پر گھاس کا گٹھا لادے پگ ڈنڈی پر چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ مرغ پاگلوں کی طرح روتا چلاتا بھاگتا دوڑتا اس کے پاس سے گذرا مگر کسان نے کوئی توجہ نہ دی۔

آخر پردیسی کے لال لال آنکھوں والے لم تڑنگ نوکر نے مرغ کو پکڑ ہی لیا۔ وہ بڑی فتح مندی کے ساتھ مرغ کو بغل میں دبوچے کبیر کے پاس سے گذرا۔ مرغ نے قہر آلود نگاہوں سے کبیر کو دیکھا اور کہا۔

"کمینے! صرف تمہاری وجہ سے مجھے قتل کیا جا رہا ہے۔ تمہیں کس سالے نے کہا تھا کہ شہر سے یہاں آؤ۔ میں کیا مزے سے کوڑے کے ڈھیر سے باسی چاول چن رہا تھا۔ ! حشر کے دن میرا پنجہ ہو گا اور تمہارا گریبان ------ ککڑوں-------"

کبیر مسکرایا اور منہ پھیر کر گنا چوسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مکان کے آنگن سے کالے مرغ کا آخری نعرہ تکبیر بلند ہوا اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد لم تڑنگ نوکر نے مرغ کی کھال، پنجے اور مردہ گردن باہر لا کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دی۔ کالا مرغ اپنی پتھرائی ہوئی بے نور آنکھوں سے ابھی تک کبیر کو دیکھ رہا تھا۔ کبیر اندر آ گیا۔ پردیسی کپڑے بدل چکا تھا۔ یعنی اس نے گرم کوٹ اور گرم پتلون پہن لی تھی۔

"چلو یار تمہیں گاؤں کی سیر کروا لائیں۔ واپسی پر کھانا بھی تیار ہو گیا ہو گا"۔

دونوں گاؤں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے خشک نہر کو پار کیا اور ایک میدان میں سے گذر کر بچوں کو کھیلتا ہوا چھوڑ کر "ماہی منڈا" گاؤں کی حدود میں داخل

ہو گئے۔ کچھ عورتیں کنوئیں کی باولی پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے پانی سے بھری ہوئی مٹکی اٹھا کر سر پر رکھی اور گاؤں کی طرف چلنے لگی۔"

"ماہی منڈا" گاؤں ویسا ہی تھا جیسا کہ پنجاب کے گاؤں ہوا کرتے ہیں۔ یعنی ایک گندا جوہڑ، گوبر کی تھاپیوں سے آراستہ مکانوں کی دیواریں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، موٹے تازے آوارہ کتے، گندے چیتھڑے لگے بچے، آٹا پیسنے والی چکی کی مسلسل آواز، کھیتوں کو جاتے یا پلٹتے ہوئے دیہاتی لوگ ٹوٹے ہوئے دروازوں والے ہندوؤں کے مکانات، جلی ہوئی برساتیاں، تنگ گلیاں، ٹوٹی ہوئی نالیاں، مسجد کے سفید مینار، ڈکراتی بھینس، زرد زرد چہروں والی بیمار عورتیں، حیران آنکھوں سے تکنے والی سہمی ہوئی لڑکیاں اور غضبناک آنکھوں سے دیکھنے والے ان کے باپ۔۔۔۔ گوبر کے ڈھیر، مکھیاں، گندگی اور بس۔۔۔۔۔ یہ تھا "ماہی منڈا"!

کبیر کو یہاں کوئی شئے عجیب اور انوکھی دکھائی نہ دی۔ وہ صرف سرسوں کماد اور سبزیوں کے دور تک پھیلے ہوئے شاداب کھیتوں کی وسعت سے متاثر ہوا تھا۔ وہ صرف اسی کشادگی، شادابی، ہریالی اور تروتازگی کے درشنوں کے لیے گاؤں آیا تھا۔ کیونکہ یہی چیز لاہور میں نہیں تھی۔ وگرنہ یہاں بھی غریبی اور بیماری عام تھی، یہاں بھی لوگ ایک وقت کی روٹی کے لیے آٹھوں پہر جانوروں کی طرح کام کرتے تھے اور یہاں بھی ایک ایکڑ زمین اور پانی کی باری پر لوگ قتل کر دیئے جاتے تھے۔

پردیسی نے کبیر کو ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے ملایا۔ چھوٹے سے قد کا نوعمر سا پتلا دبلا ڈاکٹر لڑکا بڑا شرمیلا اور مولوی نما تھا۔ اس نے چھوٹی سی داڑھی رکھی تھی۔ آنکھوں میں شرافت کی چمک اور حیاء کا تقدس تھا۔ رک رک کر سیدھی سادی باتیں کرنے لگا۔ ایک چھوٹی سی دکان میں اس نے میز کرسی لگا رکھی تھی۔ اندر سردی تھی۔ کبیر اور پردیسی باہر گلی والے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر لڑکا شاعر بھی تھا۔ اس نے رک رک کر شرمسار سا ہو کر اپنی دو تین نظمیں سنائیں۔ ایک بھینس ڈکراتی ہوئی گذر گئی۔ شاعری کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

اب پردیسی کبیر کو گاؤں کے کنارے ایک ڈیرے پر لے گیا جہاں گڑ بنایا جا رہا تھا۔ دیہاتیوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ فوراً ایک چارپائی دھوپ میں ڈال کر اس پر پھولدار چادر اور پھولدار تکیہ لگا دیا گیا۔ کبیر اور پردیسی بیٹھ گئے۔ حقہ سامنے رکھ دیا گیا۔ دو تین دیہاتی زمین پر سامنے بیٹھ گئے۔

"بابو جی کی کیا خدمت کی جائے؟"

"یہ لوگ روہتک حصار کے رہنے والے تھے۔ تقسیم کے بعد انھیں یہاں کچھ زمین الاٹ ہو گئی تھی اور ان دنوں وہ گڑ بنا رہے تھے۔ کبیر نے کہا۔

"گنے کا رس پلا دو بھائی"۔

سامنے ہی پیلنا چل رہا تھا۔ دو بیل آنکھوں پر کھوپے چڑھائے چکر لگا رہے تھے۔ وہ ایک ہی مرکز کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ ان کے خیال میں شاید وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک ہی جگہ صبح سے چل رہے تھے۔ بس پیلنے کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ جس طرح مصنوعی ستارہ زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ ایک آدمی پیلنے کے پاس بیٹھا پیلنے میں گنے ڈالے جا رہا تھا۔ زمین میں گڑھا کھود کر برتن رکھ دیا گیا تھا۔ اس برتن میں گنے کا ہلکا سبز جھاگ دار رس گر رہا تھا اور شہد کی چھوٹی چھوٹی مکھیاں ادھر ادھر منڈلا رہی تھیں۔

اس آدمی نے اس برتن میں سے دو گلاس بھر کر مہمانوں کو پیش کیے۔ یہ گلاس شیشے کے تھے۔ اور ان کے اوپر سرخ رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ کبیر ایک ہی گھونٹ میں تازہ اور میٹھا اور خوشبودار گنے کا رس پی گیا۔ لاہور کی جلی ہوئی خشک چائے پی پی کر اس کا معدہ سندھ کا ریگستان بنا ہوا تھا۔ گنے کے تازہ اور شگفتہ رس نے اس ریگستان میں جان ڈال دی اور وہ تروتازہ ہو گیا۔ کبیر تین گلاس پی گیا۔ اس کا جگر ٹھنڈا ہو گیا۔ آنکھوں میں طراوٹ آ گئی۔ سانس خوشگوار ہو گیا۔ خیالات سنہری ہو گئے۔ چہرے پر رونق آ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے معدے میں گنے کے لمبے لمبے ہرے ہرے کھیت صبح کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔

پھر وہ قریب ہی چھتی ہوئی برساتی میں آ گیا۔ یہاں آگ پر ایک بڑا سا کڑاؤ چڑھا ہوا تھا۔ اس میں تازہ اور سنہری رس ابل رہا تھا۔ برساتی اس کی میٹھی بھاپ سے بھر گئی تھی اور یہ بھاپ سانس کے ساتھ اندر جا کر لاہور کی پٹرول اور گرد ملی فضا کے مارے ہوئے پھیپھڑوں میں نئی روح پھونک رہی تھی۔ ایک آدمی لکڑی کا پھاوڑا کڑاہی میں چلا رہا تھا۔ کیونکہ اب گڑ بننے ہی والا تھا۔ اور گنے کا رس سخت ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے لکڑی کے بڑے سے سانچے کو کھرچ کر صاف کر دیا تھا۔ جب رس پک کر تیار ہو گیا تو دو آدمیوں نے مل کر کڑاہی کو اٹھایا اور خدا کا نام لے کر اسے لکڑی کے سانچے میں الٹ دیا۔ اب لکڑی کے سانچے میں پھاوڑا پھیرا جانے لگا

تاکہ گڑ کی سختی ہموار رہے اور وہ کہیں سے نرم نہ رہ جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں رس سخت ہو گیا اور گڑ تیار ہو گیا۔ اب انہوں نے اس کی گرم گرم بیلیاں بنانا شروع کر دیں۔ اور انہیں ٹوکری میں ڈالنے لگے۔ کبیر نے تھوڑا سا تازہ گرم گرم گڑ لیا اور اسے کھاتا باہر آ گیا۔

پردیسی باہر چارپائی پر بیٹھا کسانوں سے زمین کی باتیں کر رہا تھا۔ حضرت آدم کے وقت سے چلی آنے والی باتیں۔ فلاں زمین کی فصل کیسی ہوئی ہے؟ فلاں زمین کو کب پانی مل رہا ہے؟ جو فلاں قتل ہوا تھا اس کی تاریخ کس دن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ گھر واپس آ کر انہوں نے مل کر اس کالے مرغ کو کھایا جس نے ذبح ہونے سے پہلے بڑا واویلا مچایا تھا اور سارے گاؤں کے آگے رحم کی اپیل کی تھی۔ لیکن جس کی اپیل مسترد ہو گئی تھی اور لم تڑنگ نوکر نے اس کی گردن پر چھری چلا دی تھی۔ مرغ سخت رہا تھا۔ بڑا ضدی اور سخت جان تھا۔ کبیر اسے کھا رہا تھا اور اسے ہر نوالے پر کان میں کالے مرغ کی گالیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کمینے کھا رہے ہو؟ مجھے چبا رہے ہو؟"

"سالے! ایک دن میں بھی تجھے اسی طرح چباؤں گا---------"

مگر کبیر بڑے مزے سے کھائے جا رہا تھا۔ کھانے کے بعد پردیسی نے دو گھوڑے منگوائے، ان پر زین کسی، کھیس بچھوائے اور دوسرے گاؤں کی سیر کو چل پڑا۔ پردیسی فوراً گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہ زمیندار تھا اور اس قسم کی سواری کا عادی تھا۔ کبیر کبھی سائیکل پر بھی سوار نہ ہوا تھا۔ اس نے ایک پاؤں رکاب میں ڈال کر دوسری ٹانگ اٹھائی کہ گھوڑا صاحب پرے کھسک گئے۔ کبیر نے پھر کوشش کی۔ گھوڑے صاحب نے اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا۔ آخر ایک ملازم نے گھوڑے کو تھامے رکھا۔ کبیر اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ گھوڑے کی گردن پر بیٹھا ہوا ہے۔ گھوڑے صاحب مزے مزے کھیتوں کھیت ہو کر دوسرے گاؤں کی جانب چل پڑے جو چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔

کبیر کا گھوڑا کبیر ہی کی طرح بے ہنگم تھا۔ اور اس کا نہ کوئی سر تھا نہ پیر۔ وہ چلتے چلتے ایک دم کھڑا ہو جاتا اور کھڑے کھڑے یک لخت چل پڑتا۔ وہ کبھی نہ بتاتا کہ اب کھڑا ہو رہا ہے۔ اور اس خیال کا بھی اظہار نہ کرتا کہ اب چلنے والا ہے۔ ایک جگہ اس نے ایسی دولتی جھاڑی کہ کبیر گرتے گرتے بچا۔ خدا بخش پردیسی برابر کبیر کی

حالت پر ہنس رہا تھا۔

"کمینے! میری جان پر بنی ہے۔ اور تم ہنس رہے ہو"

خدا بخش پردیسی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"خدا کی قسم تم بالکل کارٹون دکھائی دے رہے ہو"۔

خدا خدا کر کے چھ کوس کا فاصلہ طے ہوا۔ گاؤں آ گیا۔ ایک ٹیوب ویل کے باہر گھوڑے رک گئے۔ خدا بخش پردیسی گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ کبیر جب نیچے اترنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی دونوں ٹانگیں لکڑی کی طرح سخت ہو گئی ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی ٹانگوں کو ہوش آیا تو وہ پردیسی کے کندھے کا سہارا لے کر گھوڑے پر ایک قہر آلود نگاہ ڈال کر گاؤں میں داخل ہو گیا۔ کبیر حیران ہو رہا تھا کہ دیہاتی لوگ عورتوں کو گھوڑوں پر زبردستی بٹھلا کر اغوا کر کے کس طرح لے جاتے ہیں۔ اگرچہ کبیر کے ذہن میں کسی عورت کے اغوا کرنے کی دیرینہ خواہش پرورش پا رہی تھی۔ لیکن اس روز اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی دیہاتی عورت کو کبھی اغوا نہیں کرے گا۔

پردیسی نے گاؤں میں اسے ایک آدمی سے ملوایا جو اس کے خیال کے مطابق وہاں کا پیر تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ دانت چمکیلے تھے۔ آنکھوں کی پتلیاں بات کرتے ہوئے ناچتی تھیں اور زبان خوب تیز چلتی تھی۔

"حضور میں تو ایک فقیر ہوں۔ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتا ہوں اور وہ بھی اچار کے ساتھ صرف ایک روٹی۔ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتا ہوں، کبھی غیر از حلال نہیں کھاتا۔ کیونکہ بقول مولانا روم۔ 'عشق و رقت آید از نان حلال' حرام کی کمائی سے عبادت مجروح ہوتی ہے۔ عشق کی واردات قلبی فسق و فجور ہو جاتی ہیں۔ اور وجدان کند ہو جاتا ہے۔ میں نے اسی موضوع پر سانگلہ ہل میں اپنے مریدوں کو ابھی پرسوں لیکچر دیا تھا۔ خوشبو کیا ہے؟ پھول آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اسے چھو سکتے ہیں۔ اسے کھا سکتے ہیں۔ مگر خوشبو کو نہ تو آپ چھو سکتے ہیں۔ اور نہ اسے پکڑ سکتے ہیں۔ بس خدا ذات خوشبو ہے۔ جو موجودات کے ہر پھول میں بسی ہوئی ہے-----"

اس کے ساتھ ہی معاً پیر صاحب کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی اور وہ انگلی سے کرسی کے بازو پر طبلہ سا بجانے لگے۔ باہر نکل کر خدا بخش پردیسی نے کبیر کو

بتایا کہ یہ شخص اپنے ہر مرید سے نذرانہ لیتا ہے۔ خود ریشمی لحاف اوڑھ کر سوتا ہے۔ اور انہیں ٹھنڈے فرش پر صرف پرالی ڈال کر سلاتا ہے۔ لوگوں نے اسے زمین مفت دے رکھی ہے۔ مرید وہاں مفت کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی مرید بغیر نذرانہ لیے آ جائے تو یہ اسے محفل سے باہر نکال دیتا ہے۔ یہ مریدوں سے گھی' چاول 'گڑ' شکر' آٹا' گنے' تمباکو' سرسوں کا تیل 'کھڈی کا کھدر اور روپے بھی وصول کرتا ہے۔ لوگ پھر بھی اس کے دیوانے ہیں۔

کبیر نے سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"اگر یہ شخص فراڈ پیر ہے تو تم اسے کیوں ملتے ہو؟"

"اس لیے کہ میں خود فراڈ ہوں"

اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ وہ ایک کھیت میں سے گزر رہے تھے۔ پردیسی نے جھک کر زرد رنگ کا ایک پھول توڑا اور کبیر کو دے کر بولا۔

"دیکھو کیسی خوشبو ہے؟"

کبیر نے پھول کو سونگھا۔ بڑی میٹھی اور بوجھل سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

"یہ کیسا پھول ہے؟" کبیر نے پوچھا۔ پردیسی نے ہنس کر کہا۔

"آلو کا"

"بکواس کرتے ہو"۔

"خدا کی قسم آلو کا پھول ہے"۔

کبیر نے زندگی بھر کبھی آلو کا پھول نہ دیکھا تھا۔ اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ آلو ایسی بھدی سبزی کا بھی پھول ہو سکتا ہے۔ اس نے پھول اپنے کوٹ میں لگا لیا۔ کچھ دیر گاؤں کی سیر کرنے کے بعد وہ دونوں واپس اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ اسی طرح دونوں گھوڑے ویران نہر کی پٹڑی پٹڑی روانہ ہو گئے۔ کبیر نے اپنا گھوڑا بدل لیا۔ لیکن یہ گھوڑا بھی پہلے والے کی طرح ضدی' اکھڑ اور موذی تھا۔ کبیر نے کہا۔

"میں مرزا سودا کے گھوڑے کی طرح اسے بغل میں دبا کر واپس جا سکتا ہوں مگر اس کی پیٹھ پر سوار ہونا بڑا دشوار ہے"۔

پردیسی نے ہنس کر کہا۔

"کمینے! یہ اصیل گھوڑا ہے اصیل ۔ اس کا لکڑدادا سکندر کی فوجوں کے ساتھ

یونان سے آیا تھا"

"پھر تو اس گھوڑے کا نام پھننا توس ہو گا۔"

"کیا خبر یہ جالی نوس ہی ہو"۔

"جالی نوس ہی ہو گا پردیسی--- ورنہ یہ مجھے اپنے اوپر لٹو کی طرح کبھی نہ گھماتا"۔

شام کو پردیسی چائے بنانے لگا تو کبیر نے کہا۔

"چائے تیار کروا کر اس گاؤں کی شگفتہ فضا کا مذاق مت اڑاؤ"

"پھر کیا پیو گے"۔

"لسی"۔

پردیسی قہقہہ لگا کر بولا۔

"سالے یونہی جوش میں نہ آؤ۔ نمونیہ ہو جائے گا"۔

"تو پھر تازہ اور گرم دودھ پلواؤ"۔

"بات ہوئی ناں"۔

پردیسی نے اپنے لم تڑنگ نوکر سے اسی وقت تازہ دودھ منگوایا اور اسے گرم کر کے کبیر کو دیا۔ کبیر نے گھونٹ پیا تو بولا۔

"معلوم ہوتا ہے جیسے ماں کا دودھ پی رہا ہوں"

خدا بخش پردیسی کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ کبیر نے کہا۔

"ہنستے کیوں ہو؟ اس دودھ میں اس دھرتی کی خوشبو ہے جس پر تم ایک سپہ سالار کی طرح اکڑ کر کھڑے ہو اور یہ لم تڑنگ نوکر گدھے کی طرح سمٹ کر بیٹھا ہے جس کے کھیتوں میں گنے کے ستون کھڑے ہیں۔ اور سرسوں کے زرد پھول غروب ہوتے سورج کی شفق میں سرخ ہو رہے ہیں۔ یہ دودھ نہیں بلکہ اس دھرتی کا سیال سانس ہے۔ پگھلی ہوئی شفق ہے اور دھرتی ہماری ماں ہے۔ یہ ماں کا دودھ ہے۔ یہ دودھ کی ماں ہے۔ اور تم ذلیل ہو جو یہاں رہ کر چائے پیتے ہو۔"

"اچھا اب شاعری مت کرو۔ دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے"۔

"بکواس بند کرو۔ یہ دودھ کبھی ٹھنڈا نہیں ہو سکتا۔ اس میں ہزاروں سورج گردش کر رہے ہیں۔ یہ ہمیشہ گرم' سحر خیز اور تنومند رہے گا۔ یہ دودھ نہیں بلکہ دنیا کے تمام حیاتین کا عطر ہے۔ جسے چاندنی راتوں میں کنواری لڑکیوں نے اپنے نازک

ہاتھوں سے کشید کیا ہے۔ تم اگر اس دودھ کو کان لگا کر سنو تو تمہیں اس میں سے چوڑیوں کی جھنکار اور کنواریوں کے چاندی کی گھنٹیوں ایسے قہقہے سنائی دیں گے"۔

پردیسی ہنستا رہا اور کبیر مزے لے لے کر دودھ پیتا رہا۔ دودھ پینے کے بعد پردیسی اسے ساتھ لے کر ایک بار پھر گاؤں کی گلیوں میں آ گیا۔ سورج مغرب کی جانب سرسوں کے کھیتوں پر کافی جھک آیا تھا۔ وہ گہرا سرخ ہو چلا تھا اور کھیتوں میں جیسے آگ سی لگ رہی تھی۔ گاؤں کے کائی لگے کالے کالے مکانوں کی منڈیریں سرخ ہو گئی تھیں۔ گلیوں میں ہلکا ہلکا سرد اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل نکلی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں پردیسی؟"

"تم چپ چاپ میرے ساتھ چلے آؤ"۔

پردیسی ایک پرانی سی حویلی کے عقب میں آ کر رک گیا۔ یہاں سوائے ایک بیل کے اور کوئی نہیں تھا۔ یہ بیل زمین پر بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ کیکر کے درخت میں ٹڈیاں بول رہی تھیں۔ پردیسی نے ایک جھکے ہوئے دروازے کا پٹ ہاتھ سے بجایا۔ کسی نے اندر سے کواڑ کی کنڈی کھول دی۔

"اندر آ جاؤ"۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ پردیسی کبیر کو ساتھ لے کر اندر داخل ہو گیا۔ کوٹھری میں دھواں بھرا ہوا تھا اور ایک مخنی سی لالٹین طاق میں جل رہی تھی۔ کبیر نے دیکھا کہ وہی لڑکی جو صبح گاگر سر پر رکھے کر مٹکاتی کنوئیں سے واپس جا رہی تھی چولہے کے پاس بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس کی ایک لٹ ماتھے کے آگے آ کر جھول رہی تھی اور سینہ تھوڑا تھوڑا ننگا ہو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے انہیں پلنگ پر بیٹھنے کو کہا۔ پردیسی نے کہا۔

"نہیں ماسی مہراں اب ہم جاتے ہیں۔ یونہی سیر کرتے ادھر نکل آئے تھے۔ تم ذرا باہر آؤ گی" کبیر بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے شکر کا سانس لیا۔ کیونکہ اندر دھوئیں سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ عورتیں اندر اتنے آرام سے کیسے کام کر رہی ہیں۔ شاید وہ اس ماحول کی عادی ہو گئی تھیں۔ اور اب ان کا کھلی ہوا میں دم گھٹنے لگے۔ ذرا پرے کھڑے ہو کر پردیسی اور ماسی مہراں باتیں کر رہے تھے۔ کبیر جگالی کرتے بیل کے پاس کھڑا ہو کر سگریٹ پینے

لگا۔ بیل نے ایک آنکھ اٹھا کر کبیر کو دیکھا۔ کبیر نے کنکھیوں سے بیل کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ بیل نے ناک سکیڑ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ کبیر ہنس پڑا اور غروب ہوتے سورج کی طرف دیکھنے لگا۔ جو دور درختوں کے جھنڈوں کے عقب میں ڈوب رہا تھا۔

کبیر نے دیکھا کہ خدا بخش پردیسی نے جیب سے دس روپے کے دو نوٹ نکال کر ماسی مہراں کو دیئے۔ ماسی مہراں نے ادھر ادھر دیکھ کر جلدی سے نوٹ دوپٹے میں چھپا لیے اور فوراً کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر غائب ہو گئی۔

پردیسی نے کہا۔

"آؤ بھئی چلیں"۔

کبیر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے دوست کے ہمراہ چل پڑا۔

"تم نے اسے کیا دیا ہے؟"

"تم پوچھنے والے کون ہو؟"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"تمہاری خدمت"۔

"بکواس مت کرو۔ میں ان تمام باتوں کو ناپسند کرتا ہوں"۔

"ارے جا بڑا آیا برہم چاری ------ کمینے رات کو دیکھ لوں گا۔ کہ تو کتنے پانیوں میں ہے"۔

کبیر خاموش ہو گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ اب گاؤں کی گلیوں میں شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ کھیتوں میں ابھی ہلکی ہلکی روشنی باقی تھی۔ دن کی آخری روشنی! دن کا آخری سانس ----! کھیتوں اور میدانوں میں اندھیرے کے ساتھ ساتھ خاموشیوں کے قافلے اتر رہے تھے۔ گاؤں کی طرف سے کبھی کبھی ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آ جاتی تھی۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ پردیسی کے مکان میں سپرٹ والا چھوٹا سا گیس میز پر رکھا جل رہا تھا۔ اس کی روشنی کافی تھی اور معلوم ہو رہا تھا کہ ایک سو کینڈل پاور کا بلب جل رہا ہے۔ اس کی روشنی میں لم ترنگ نوکر دوسرے ملازموں کے ساتھ مل کر گوشت بھون رہا تھا۔ سردی بہت ہو رہی تھی۔ دونوں دوست برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے انگیٹھی میں کوئلے جلوا کر پاس رکھوا لی۔ وہ سگریٹ پینے، آگ تاپنے۔ اور باتیں کرنے لگے۔

اتنے میں کھانا تیار ہو گیا۔
پردیسی نے کبیر سے کہا۔
"آؤ اندر چل کر بیٹھ جائیں"۔
انگیٹھی کمرے میں رکھ دی گئی۔ کبیر اور پردیسی کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں آمنے سامنے دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پرانا سا صوفہ رکھا تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ پردیسی یہاں اکیلا رہتا تھا۔ دوسرا پلنگ اس نے کسی دوسرے زمیندار کے گھر سے منگوا لیا تھا۔ کبیر نے کہا۔
"میں الگ کمرے میں سوؤں گا"۔
"وہ کیوں؟" پردیسی نے حیرانی سے پوچھا۔
"تم مجھے رات کو اپنی بے معنی باتوں سے بور کرو گے"۔
"نہیں یار۔ دونوں یہاں سوئیں گے۔ رات کو باتیں کریں گے اتنی دیر بعد تم مجھے ملے ہو"۔
"بکواس بند کرو اور پلنگ فورا" دوسرے کمرے میں ڈلوا دو"۔
مجبورا" پردیسی نے نوکروں کو بلوا کر کبیر کا پلنگ ساتھ والے چھوٹے کمرے میں ڈلوا کر بستر بچھوا دیا۔
"لیکن تم ابھی تو میرے پاس بیٹھو گے ناں"۔
"ہاں! بشرطیکہ تم باتیں کم کرو"۔
پردیسی نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"کمینے! اتنے دنوں بعد ملے ہو۔ تم سے باتیں نہیں کروں گا اور کیا ان دیواروں سے باتیں کروں گا"۔
"تم پہلے کیا کیا کرتے تھے"۔
"پہلے بور ہوا کرتا تھا۔ ان نوکروں سے قصہ کہانی کہہ لیا کرتا تھا"۔
"تو پھر آج بھی انہی کے پاس جا کر محفل لگاؤ"۔
"بڑے ذلیل آدمی ہو تم۔ اچھا ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں"۔
اتنا کہہ کر پردیسی نے الماری میں سے دیسی شراب کی بوتل نکال کر میز پر رکھ دی۔
"اب کہو میرے پاس بیٹھو گے یا دوسرے کمرے میں جاؤ گے؟"

کبیر نے شراب کی بوتل پر ہاتھ پھیر کر کہا۔
"میں کچھ دیر کے لیے دوسرے کمرے میں جانے کا پروگرام ملتوی کرتا ہوں تم گلاس اور پانی منگواؤ"۔
پردیسی نے بوتل گود میں دبا کر کہا۔
"خبردار جو اسے ہاتھ لگایا۔ میں ساری شراب تمہارے سامنے بیٹھ کر پیوں گا اور تمہیں ترسا دوں گا"۔
"تم اتنے ذلیل نہیں ہو سکتے۔ یہ شراب کی توہین ہے۔ کوئی بھی اچھا شرابی کم از کم شراب کی توہین نہیں کر سکتا"۔
"پھر میں تو آج اس حرامزادی کی بے عزتی کر کے ہی رہوں گا"۔
"میں اس بوتل سے زیادہ سخت ہوں"۔
"میں تمہاری گردن اتار کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا"۔
اسی قسم کی لایعنی گفتگو کے بعد دونوں دوست مل کر بیٹھ گئے اور شراب پینے لگے۔ پردیسی نے کبیر کے لیے خاص طور پر شہر سے شراب منگوائی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کبیر گاؤں کی شراب پسند نہیں کرتا۔
بری چیز ہمیشہ شہر کی اچھی ہوتی ہے۔ شہر میں تمہیں بہترین سے بہترین بری شے مل سکتی ہے۔ گاؤں صرف دودھ، مکھن، تازہ ہوا اور صحت مند سبزیوں کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ ہماری بد نصیبی اور معاشرے کی ناانصافی ہے کہ یہاں بھی ٹی بی، غریبی اور بے حیائی کے مریض پائے جاتے ہیں۔ یہ تو کوتوال کے گھر میں بیٹھ کر جوا کھیلنے والی بات ہے نیچر کی آغوش میں کسی کو بیمار، پریشان، بے حیا اور مفلس نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ہماری تہذیب نے شہروں کے ساتھ ساتھ گاؤں کو بھی تباہ کر دیا ہے۔ پکی سڑکیں اب دیہات کو بھی جانے لگی ہیں۔
پردیسی نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔
"اب تم اپنی وعظ بند کرو اور گلاس خالی کرو۔ میں تیسرا پیگ بنانے لگا ہوں"۔
چوتھے پیگ پر دونوں کو خوب نشہ ہو گیا۔ کبیر نے چوتھے پیگ کے بعد ہاتھ اٹھا لیا۔ پردیسی نے ایک دو پیگ اور پیئے اور بوتل الماری میں بند کر دی۔ وہاں کھانا آ گیا۔ انہوں نے ڈٹ کر بھنا ہوا گوشت اور صبح کا مرغ کھایا۔

کبیر نے کالے مرغ کی ٹانگ اٹھا کر کہا۔

"تم نے میرے یار کو قتل کر دیا پردیسی! یہ مرغا بھی پردیسی تھا۔ حشر کے دن تجھے مرغا بننا پڑے گا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر پردیسی جھومتا جھامتا باہر گیا۔ اس نے نوکروں کو کہہ دیا کہ وہ اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں جا کر سو جائیں۔ اور اندر کوئی نہ آئے۔ کبیر نے کپڑے بدل لیے تھے۔ یعنی اس نے اپنی پتلون ' سویٹر اتار کر پردیسی کا تہہ بند پہن لیا تھا اوپر کمبل اوڑھ رکھا تھا اور پردیسی پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ گیس میز پر جل رہا تھا اس کی بو کے اخراج کے لیے روشن وان کھلوایا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں وہ نشے میں مگن تھا اس نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا اور نعرہ لگایا۔

"پورے گیارہ بجے وہ حسن کی سرکار یہاں آ رہی ہے اور اس وقت دس بجے ہیں۔ آج اسے کچا چبا جانے کا دن ہے"۔

کبیر نے آنکھیں اٹھائے بغیر پوچھا۔

"اخ تھو---------" پردیسی نے تھوک کر نفرت سے کہا۔

"لعنت ہے اس بڑھیا کھوسٹ پر---------- اس کی تو نرم نازک مٹکی اٹھا کر ٹھمک ٹھمک چلنے والی چھوکری آ رہی ہے"۔

اور اس کے ساتھ ہی پردیسی نے نقلی مٹکا سر پر رکھ کر ' ایک ہاتھ کمر کے ساتھ لگا کر لڑکیوں کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلنا شروع کر دیا۔ کبیر اس کی حماقتوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اور خوش رہا کہ وہ اپنے دوست کو اصلی روپ میں دیکھ رہا ہے۔ وہ اس روپ کو بہت پسند کرتا تھا اور دنیا میں صرف اسی ایک روپ کی بادشاہت چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پردیسی نے ابھی تک شادی نہیں کی اور اسے اس قسم کی باتیں کبھی کبھی کرنی پڑتی ہیں۔

گیارہ بجے تک دونوں دوست کمرے میں ہنستے مذاق کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ سوا گیارہ بج گئے مگر کوئی نہ آیا۔ ساڑھے گیارہ ہو گئے۔ پردیسی کا نشہ کچھ کچھ اترنے لگا۔

"وہ حرامزادی ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ ضرور آ رہی ہو گی۔"

کبیر نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے کہا

"تم اس کا انتظار کرو۔ میں تو سونے چلا"۔

اچانک گاؤں کی طرف کوئی کتا بھونکا۔ پردیسی نے کان کھڑے کر لیے اور اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"کوئی آ رہا ہے۔ کوئی کھیتوں میں سے گذر رہا ہے"۔

کبیر نے سگریٹ بجھا کر کہا۔

"راہرو ہو گا کہیں اور چلا جائے گا۔"

پردیسی نے مٹھی بھینچ کر کہا۔

"میں شرط لگاتا ہوں کہ یہ سوائے اس حسینہ دلنواز کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم میرے ساتھ باہر آؤ"

"کیا میرا چلنا بہت ضروری ہے"۔

"نہیں"۔

"تو پھر میں ضرور ساتھ جاؤں گا"۔

باہر سردیوں کا گہرا نیلا آسمان ستاروں سے بھرا پڑا تھا۔ اور جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ کبیر تو حیران اور مسحور سا ہو کر رہ گیا۔ شہر کے آسمان پر اس نے اندھیری سے اندھیری رات کو بھی اتنے زیادہ ستارے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اور پھر وہ گل داؤدی کے پھول اتنے بڑے بڑے تھے اور یوں چمک رہے تھے۔ جیسے ہر ستارے کے اندر بڑے بڑے الاؤ جل رہے ہوں۔ ہوا انتہائی سرد تھی اور اس قدر تروتازہ' پاکیزہ اور آکسیجن سے پر کہ کبیر کو ہر سانس کے ساتھ جسم کی کوئی نہ کوئی بیماری زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اندر نئی زندگی اور نیا خون دوڑتا محسوس کرنے لگا۔ پہلے اس کا نشہ ایک دم تیز ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ پردیسی کو کسی بات کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ نشے میں دھت ریچھ کی طرح پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا فضا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا لڑکی کے جسم کی بو سونگھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ گاؤں کے مکان گھپ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پردیسی کے مکان اور گاؤں کے درمیان صرف سوکھی ہوئی ویران نہر ہی حائل تھی۔ کتے کے بھونکنے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ اچانک پردیسی نے کہا۔

"کوئی آ رہا ہے"۔

اس کے ساتھ ہی ان دونوں کو نہر کے اونچے کنارے پر ایک سایہ سا ابھرتا نظر

آیا۔

"آ گئی۔ وہ آ گئی۔۔۔۔۔۔۔۔"

پردیسی بچوں کی طرح خوشی سے جھومنے لگا۔ سایہ اب ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں جب سایہ کوئی بیس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو کبیر نے دیکھا کہ ایک لڑکی چادر میں لپٹی ادھر ادھر دیکھتی تیز تیز قدموں سے چلی آ رہی تھی۔ کبیر نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ پردیسی نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس پر اپنا کمبل ڈال دیا۔ کبیر واپس کمرے میں آ کر پردیسی کے پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں دروازہ آہستہ سے کھلا اور خدا بخش پردیسی لڑکی کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہو گیا۔ لڑکی چپکے سے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ پردیسی نے کمبل اتار کر صوفے پر ڈال دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"شریفاں! میری جان آگے آ کر بیٹھ جاؤ۔ آؤ میں تمہیں اپنے دوست سے ملاؤں۔ یہ میرا یار غار ہے۔ لاہور سے آیا ہے۔ بڑا بابو ہے۔ لاٹ صاحب کے دفتر میں افسر لگا ہے۔ تمہاری زمینوں کے کاغذ ان کے پاس ہی گئے ہوئے ہیں۔ بابو نے کہا ہے کہ بس جاتے ہی کاغذوں پر دستخط کر دوں گا"۔

پردیسی شریفاں کو بغل میں لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ تعارف اس نے کبیر سے کروایا اور اسے لے کر خود بیٹھ گیا اور چوما چاٹی کرنے لگا۔ گیس کی تیز روشنی میں لڑکی کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ نقش پتے پتے سے تھے۔ عمر سولہ یا سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ دبلی مگر صحت مند اور خوش شکل لڑکی تھی۔ اس نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ اور پردیسی سے لپٹنے یا بوس و کنار میں کسی قسم کی پیش قدمی نہیں کر رہی تھی۔ پردیسی نے انگریزی میں کہا۔

"کبیر! اس کی عمر اور جھوٹ موٹ کی شرم پر مت جانا۔ یہ بڑے زمینداروں کے پاس دور دور تک جاتی ہے۔ ہے تو دھان پان' مگر گڑیل جوانوں کو ایک پل میں گرا کر رکھ دیتی ہے۔ ظالم کے پٹھوں میں بجلی بھری ہے بجلی۔۔۔۔۔۔"

پردیسی نے الماری میں سے شراب نکال کر میز پر رکھ دی اور گلاس میں بھر کر چند گھونٹ خود پیئے اور باقی لڑکی کو پلا دی۔ لڑکی نے تھوڑی سی مزاحمت کی مگر پھر غٹاغٹ پی گئی۔ پردیسی نے انگریزی میں کہا۔

"دیکھتے جاؤ یہ کیا کیا نہیں کرتی۔ پینے پر آئے تو بوتل کی بوتل خالی کر دے" کبیر پلنگ پر نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ اور بڑی دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی شراب کے دو گلاس پی گئی۔ اسے نشہ ہو گیا۔ اب وہ کھلنے لگی تھی۔ وہ باتیں کرنے لگی اور کبیر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ایک بار اس نے کبیر کو اشارے سے بلایا بھی۔ پھر پردیسی سے کہنے لگی۔

"بابو جی حاجی ہیں کیا؟"

پردیسی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ کبیر خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا اور ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ پردیسی نے کمرے میں آگ جلوا رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے فضا گرم ہو گئی تھی۔ وہ صرف بنیان اور تہہ بند میں تھا۔ ویسے بھی چونکہ انہوں نے شراب پی رکھی تھی اس لیے انہیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ لڑکی نے اٹھ کر قمیض اتاری اور صوفے پر پھینک دی۔ اس کے سانولے بازو گول گول تھے اور پیٹ ہموار تھا۔ وہ شراب کے نشے میں کھڑے کھڑے جھوم رہی تھی' وہ کبیر کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بڑی نشیلی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ کبیر اس کی میلی سی انگیا کو دیکھنے لگا جس میں سے اس کا عریاں سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کبیر نے محسوس کیا کہ شریفاں کے سانولے بدن میں سے سینک اٹھ رہا ہے۔ کبیر کا نشہ اتر رہا تھا اور اب اس کی جگہ سرور کی ایک خاص کیفیت چھا رہی تھی۔ کبیر سگریٹ منہ میں دبائے بڑے غور سے نیم عریاں شریفاں کے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ پردیسی نے گلاس میں بچی ہوئی شراب حلق میں انڈیلی۔ ایک اور پیگ بنایا۔ شراب سے بھرا ہوا گلاس ہاتھ میں پکڑ کر شریفاں کے پاس آیا۔ اپنے ہاتھوں سے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے ناک سکیڑ کر چند گھونٹ پیئے اور اور اپنا آپ پردیسی کے حوالے کر دیا۔

شراب اور شریفاں کی ماں اپنا کام کر چکی تھی' اب خدا بخش پردیسی کو اپنا کام کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے دو تین موم بتیاں تھالی میں روشن کیں۔ گیس بجھایا اور شریفاں کو گود میں اٹھا کر کمرے کے چکر لگانے لگا اور اس کے جسم کو جگہ جگہ سے چومنے لگا۔ کبیر نے ایک موم بتی اٹھائی اور ساتھ والے کمرے میں جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور جسم ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی عادت کے مطابق نیند سے باقاعدہ مقابلہ کر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آنے لگی تھیں' کبھی یوں معلوم ہوتا

جیسے کوئی اچانک پلنگ پر سے نیچے گر پڑا ہے اور کبھی یوں لگتا جیسے کوئی مزدور اپنی
طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھائے ہانپتا کانپتا چڑھائی چڑھ رہا ہے۔ کبیر کی آنکھوں پر نیند کا
غلبہ ہونے لگا۔ اچانک ساتھ والے کمرے سے شریفاں کے قے کرنے کی آواز سنائی
دی۔ کبیر نے سگریٹ بجھا دیا اور لحاف منہ کے اوپر کر لیا۔ وہ قے کی آواز برداشت
نہیں کر سکتا تھا۔ شریفاں قے پر قے کرنے لگی۔ کبیر نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس
لیں۔ اس کے بعد اسے نیند آ گئی۔ کانوں میں اس کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ سو
گیا۔

کوئی دو گھنٹے بعد اس کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ شریفاں اس
کے لحاف میں گھسی ہوئی ہے۔ اور اس سے خرمستیاں کر رہی ہے۔ کبیر نے اٹھ کر
موم بتی جلائی اور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا کہ میری نیند میں خلل ڈالو؟"

شریفاں ہنسی اور کبیر سے چہلیں کرنے لگی۔ کبیر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اگر تم نے ایک منٹ کے اندر اندر میرا پلنگ خالی نہ کیا تو میں تمہیں اٹھا کر
باہر کھیتوں میں پھینک دوں گا"۔

"بابو جی مجھ سے ناراض ہو گیا؟"

شریفاں نے اپنا منہ کبیر کے قریب لا کر کہا۔ اس کے منہ سے شراب کی بدبو
اٹھ رہی تھی۔ کبیر نے ہاتھ سے اس کا چہرہ پیچھے ہٹا کر کہا۔

"آدھا منٹ گذر گیا ہے"۔

شریفاں ہنسنے لگی۔

"ہی ہی ہی ------ ہی ہی ہی ------"

کبیر گھڑی دیکھنے لگا۔ جب پورا ایک منٹ گذر گیا تو اس نے نیم عریاں شریفاں
کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور باہر والے دروازے کی طرف چل پڑا۔
شریفاں نے ٹانگیں چلانا شروع کر دیں اور کہا۔

"ہائے بابو! تم تو مجھے مارنا چاہتے ہو۔ مجھے اتار دو۔ میں پھر تمہارے پاس کبھی
نہیں آؤں گی"۔

کبیر نے شریفاں کو نیچے اتار دیا۔ شریفاں نے نفرت سے کبیر کو دیکھا۔ غصے
سے سر کو جھٹکا دیا اور پردیسی کے کمرے میں گھس گئی۔ کبیر نے لحاف کو اچھی طرح

سے جھاڑا۔ دروازہ کھول کر ایک پل کے لیے سرد اور تازہ ہوا اپنے کمرے میں داخل
کی۔ دروازہ بند کیا۔ موم بتی گل کی اور سو گیا۔

حسب عادت کبیر کی صبح صبح آنکھ کھل گئی۔ وہ کمبل لپیٹ کر سیر کو باہر کھیتوں
میں نکل گیا۔ کوئی گھنٹے بعد واپس آیا۔ دن نکل آیا تھا۔ لم تڑنگ نوکر باورچی خانے میں
آگ جلائے دودھ گرم کر رہا تھا۔ پردیسی اپنے کمرے میں لحاف میں دبکا کٹے ہوئے
درخت کی طرح بے سدھ پڑا تھا اور بے ہنگم خراٹے لے رہا تھا۔ شریفاں صبح صبح ہی
چلی گئی تھی۔

کوئی دس بجے خدا بخش پردیسی اٹھا۔ کبیر اس وقت کوٹ پہن کر جانے کو تیار
کھڑا تھا۔ جب اس نے پردیسی سے کہا کہ وہ لاہور جا رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا۔

"ہاں میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ یہ جگہ لاہور سے زیادہ ویران ہے"۔

"یار کمال کرتے ہو۔ اتنی جلدی کیوں؟ کم از کم ایک ہفتہ تو اور ٹھہرتے"۔

لیکن کبیر رکنے والے دن پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے گاؤں میں جا کر ایک
تانگہ کرائے پر لیا اور پردیسی سے ہاتھ ملا کر اکیلا ہی پسرور کی جانب روانہ ہو گیا۔ پسرور
کے سٹیشن پر لاہور جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد زیتون نے شاہدہ سے کہا کہ وہ سینما دیکھنے جا رہی
ہے۔ اس نے شاہدہ کو بھی دعوت دی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ رات کو اس کا وکیل
دوست اس کے پاس آ رہا ہے۔ اور وہ بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ اور وہ
چاہتی بھی یہی تھی کہ اکیلی ہی جائے۔ چنانچہ کوئی آٹھ بجے کے قریب زیتون گھر سے
نکل کھڑی ہوئی ۔ ایک گھنٹہ اس نے ایک ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر گذار دیا۔
پورے نو بجے وہ قیصر سینما کی طرف آ گئی۔

وہاں سے رات کا آخری شو دیکھ کر وہ کوئی سوا بارہ بجے کے قریب باہر نکلی اور
کبیر کے مکان کی طرف چل پڑی۔ اس کے مکان کے باہر کھڑی ہو کر اس نے دیکھا
کہ اندر بتی جل رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر
بعد دروازہ کھلا اور سامنے کبیر کھڑا تھا۔

"تم زیتون؟"

"ہاں"۔

"اندر آ جاؤ"۔

زیتون کبیر کے ساتھ اندر کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی پرانا بستر۔ کتابوں سے بھرا ہوا میز۔ بوسیدہ آرام کرسی اور پانی کی صراحی اور دیوار سے لٹکتا ہوا کیلنڈر۔ جس پر شاہی مسجد کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ کبیر نے بتی جلا رکھی تھی۔ ایک کتاب سرہانے کھلی پڑی تھی۔ کمرے میں سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"تم پڑھ رہے تھے کیا؟"

"ہاں --- تم اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟"

زیتون نے مسکرا کر کبیر کو دیکھا۔ برقعہ اتار کر پلنگ پر رکھا اور آرام کرسی پر بڑے سکون سے بیٹھ گئی۔

"تم نے جو کہا تھا کہ تم رات بارہ بجے کے بعد مل سکتے ہو۔ آج تم سے ملنے کو جی چاہا اور میں چلی آئی"۔

کبیر مسکرایا۔

"بہت خوب --- اچھا کیا تم نے۔ لیکن اب میں بارہ بجے سے پہلے بھی مل سکتا ہوں"

"اچھا؟" زیتون نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں --- میں نے اپنے قرض اتار دیئے ہیں"

"مبارک ہو --- کیا کہیں سے، لاٹری نکل آئی تھی؟"

کبیر ہنسنے لگا۔

"ایک اور جگہ سے قرض لے کر پہلا قرض صاف کر دیا۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ کمرے کی بتی بھی جلنے لگی ہے۔ مکان کا کرایہ بھی ادا کر دیا ہے"۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کسی قسم کی پریشانی اٹھانی پڑے"۔

اس کا کبیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اور گردن جھکائے جیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فرش کو تک رہا تھا۔ جہاں سگریٹ کی راکھ بکھری ہوئی تھی۔ زیتون نے بھی یہ بات کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر زیتون نے سر اٹھایا اور بولی"۔

"میں تمہارے پاس ایک خاص مقصد لے کر آئی ہوں"۔

"کیا بات ہے؟"

زیتون نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔

"میں شادی کر رہی ہوں"۔

کبیر نے مسکرا کر زیتون کو دیکھا اور سگریٹ سلگا کر بولا۔

"مبارک ہو۔ مگر وہ خوش نصیب کون ہے؟"

"تمہارا دوست"۔

"میرا دوست؟"

"ہاں--- جو محکمہ نہر کے ورکشاپ میں مستری ہے"۔

کبیر نے حیرت سے زیتون کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ زیتون اس مستری سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ جو رنڈوا ہے اور جس کی آمدنی بھی محدود ہے۔

"لیکن تم ایک سو پچیس روپے ماہوار میں ایک ان پڑھ کے ساتھ دو لڑکیوں سمیت گذارہ کر لو گی؟"

زیتون نے چہرہ اوپر اٹھا کر کہا۔

"میں شریف بیوی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ اگر اس کے لئے مجھے دن میں ایک وقت بھی روٹی مل جائے تو میں تیار ہوں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے--- میں کل ہی اس سے بات کرتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ شادی ضرور ہو جائے گی۔ پھر بھی تم ایک بار پھر سوچ سمجھ لو"۔

"نیکی کے کام کے لئے صرف ایک بار سوچنا ہی کافی ہوتا ہے"۔

کبیر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اب مزید سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں تھی۔

اس رات کی طرح کبیر نے پلنگ خالی کر دیا۔ زیتون کے انکار کے باوجود اس نے زیتون کو اپنے پلنگ پر سلا دیا اور خود آرام کرسی پر کمبل اوڑھ کر نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر تو وہ پڑھتا رہا۔ پھر اس نے بتی بجھا دی اور آنکھیں بند کر کے نیند کے خلاف جنگ کرنے لگا۔ زیتون کو نیند آ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد کبیر بھی سو گیا۔

اگلے روز کبیر نے زیتون کو ساتھ لیا اور یونیورسٹی کے بس سٹاپ پر آ گیا۔ یہاں سے اس نے زیتون سے چار بجے ملنے کا وعدہ کر کے اسے بس میں سوار کروا دیا

اور خود اپنے مستری دوست سے ملنے محکمہ نہر کے ورکشاپ کی طرف چل پڑا۔ مستری اسے ورکشاپ میں کام کرتا مل گیا۔ ذرا ڈھلتی عمر کا بیوقوف سا سیدھا سادا سانولا دبلا پتلا آدمی تھا۔ کبیر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ ورکشاپ سے باہر لے آیا۔

''لیکن میں شادی پر کچھ خرچ نہ کر سکوں گا۔ بس غریبانہ انداز میں ....'' اکبر نے بات کاٹ کر کہا۔

''لڑکی دو کپڑوں میں تمہارے پاس آجائے گی۔ باقی تم جانو اور تمہارا کام''۔

مستری بہت خوش ہوا ۔ اس کی تو خدا نے سن لی تھی۔ تین روز بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ کیونکہ نہ تو مستری ہی کو کسی سے کچھ پوچھنا تھا اور نہ کبیر کو کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت تھی۔ کبیر بڑا خوش خوش مستری سے اجازت لے کر وہاں سے آگیا۔

۴ بجے سہ پہر کو اس نے زیتون سے مل کر اسے خوش خبری سنا دی۔ زیتون کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے مستقبل کے سدھرنے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ اب وہ باقی ماندہ زندگی ایک شریف بیوی بن کر گذار سکے گی۔ اس کے بھی بچے پیدا ہوں گے۔ وہ بھی ایک نیک دل اور ذمہ دار ماں ہو گی۔ خدمت گذار بیوی ہو گی۔ وہ پھٹے ہوئے کپڑے پہن کر گذر بسر کرے گی۔ مگر گھر کی چار دیواری سے باہر کبھی قدم نہیں رکھے گی۔ اسے صرف یہی ایک ڈر تھا کہ کہیں اس کے خاوند کو اس کی پچھلی زندگی کے واقعات کا علم نہ ہو جائے۔ لیکن اس کے لئے اس نے خدا پر بھروسہ کر رکھا تھا۔

تین دن بعد زیتون کی مستری فیروز دین سے شادی ہو گئی۔

یہ شادی کبیر کے ایک دوست کے ہاں ہوئی۔ فیروز اپنے باپ اور محلے کے تین بزرگ آدمیوں کو لے کر کبیر کے دوست کے ہاں آ گیا۔ وہاں مستری فیروز دین سے زیتون کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔ چائے اور مٹھائی سے مہمانوں کی خاطر مدارات کی گئی اور کوئی دو گھنٹے بعد زیتون کو اس کے خاوند کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ کبیر نے مستری کو یہ ضرور بتا دیا تھا کہ زیتون کی پہلے ایک جگہ شادی ہوئی تھی مگر اس کی نبھ نہ سکی اور ایک سال بعد طلاق ہو گئی۔

مستری فیروز دین بڑی خوشی خوشی برات لے کر واپس گھر آ گیا۔ آج اس کی

مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کی بہنوں نے دلہن کا خیر مقدم کیا۔ دلہن خوش شکل، اور جوان تھی، ان کے خیال میں تو ان کے بھائی کی قسمت کھل گئی تھی جو اسے چاند ایسی دلہن مل گئی تھی۔ زیتون دلہن کے لباس میں شرم سے سر جھکائے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کی سوتیلی بیٹیاں نئے کپڑے پہنے اس کے اردگرد بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ڈھولک بھی بجائے اور گیت بھی گائے۔ پھر سب لوگ چلے گئے۔ لڑکیاں سو گئیں۔ فیروز دین کا باپ بھی سو گیا۔ مستری فیروز دین نے سیڑھیوں کے نیچے والی کھولی میں سے کباڑ خانے کا سامان نکال کر اس میں پہلی رات دلہن سے ملاقات کرنے کے لئے ایک چارپائی بچھا دی تھی۔ اس کھولی میں صرف ایک چارپائی ہی بچھ سکتی تھی۔ اس گھر میں اور کوئی جگہ تھی ہی نہیں۔ رات کو جب سب سو گئے تو مستری فیروز دین دھوتی باندھے ۔ نئی قمیض پہنے۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور سر کے بالوں میں خوشبو دار تیل لگائے حجلہ عروسی یعنی کھولی میں داخل ہوا۔ اس نے سر کے بال خضاب لگا کر کالے کر رکھے تھے۔ کھولی میں ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔ زیتون نے سر اٹھا کر پہلی بار اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ چونکہ صرف شوہر کو دیکھ رہی تھی اور اسے سوائے شوہر کے اور کچھ نہیں چاہئے تھا اس لئے اس نے ایک پل کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ اس کے خاوند کے چہرے پر چند ایک جھریاں ہیں۔ وہ کمزور سا ادھیڑ عمر کا ہے۔ اس کے ہونٹ چپٹے اور گندے ہیں اور نچلی قطار کے چار دانت بناوٹی ہیں۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنا آپ پوری دیانتداری اور خلوص کے ساتھ اپنے خاوند کے حوالے کر دیا۔

زیتون نے ایک شریف اور خدمت شعار بیوی کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کر دیا۔ وہ صبح صبح اٹھ بیٹھتی۔ وضو کر کے نماز پڑھتی ۔ قرآن شریف کی تلاوت کرتی۔ آگ جلا کر چائے کے لئے پانی رکھتی۔ پھر سارے گھر میں جھاڑو دیتی ۔ اپنی دونوں بچیوں کو جگاتی۔ ان کے منہ ہاتھ دھلانے میں ان کی مدد کرتی۔ ان کے بالوں میں کنگھی کرتی۔ پھر خاوند کو جگاتی ۔ اسے روٹی اور چائے پکا کر دیتی۔ اسے سامنے بیٹھ کر کھلاتی۔ پھر اپنے سسر کو چائے دیتی ۔ اپنی دونوں سوتیلی لڑکیوں کو ناشتہ کرواتی۔ اپنے خاوند کے ڈبے میں روٹی اور رات کا سالن گرم کر کے ڈالتی۔ جب وہ ورکشاپ چلا جاتا تو خود ناشتہ کرتی۔ سارے برتن مانجھتی لڑکیاں سکول نہیں جاتی تھیں۔ وہ کام کاج

میں اپنی سوتیلی ماں کا ہاتھ بٹاتیں۔ دوپہر کو زیتون بازار سے کوئی سبزی وغیرہ منگوا کر پکاتی۔ روٹی پکا کر بچیوں کو اور اپنے سسر کو کھلاتی۔ اس کا سسر دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے بوڑھے مستری کی دکان پر چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ شام کو جب اس کا خاوند ورکشاپ سے واپس آتا تو وہ اس کا منہ ہاتھ دھلاتی۔ اس کے دھوئے ہوئے کپڑے لا کر اسے دیتی۔ اسے اپنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھلاتی۔ جب وہ بستر پر لیٹ جاتا تو اس کے پاؤں دابنا شروع کر دیتی۔ وہ اس سے پیار بھری باتیں کرنے لگتا۔ جب تک وہ سو نہ جاتا زیتون برابر اسے دابے جاتی۔ پھر سب کو سلا کر وہ خود چھوٹی لڑکی کے ساتھ چارپائی پر پڑ کر سو جاتی۔

اپنے خاوند کی خدمت کو زیتون نے اپنا ایمان بنا لیا تھا۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ غریبی میں بھی اپنے خاوند کو کبھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گی اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھے گی۔ وہ اس کی لڑکیوں سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور انہیں ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیتی تھی کہ وہ ان کی سوتیلی ماں ہے۔ وہ اپنے خاوند کے باپ کا بھی پورا خیال رکھتی تھی۔ وہ اگر آدھی رات کو پانی مانگتے تو زیتون نیند سے بیدار ہو جاتی اور خود اٹھ کر بوڑھے کو پانی پلاتی۔

مستری فیروز دین کی زندگی کا تو نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ تو ایک بالکل ہی نئی دنیا میں آ گیا تھا۔ وہ تو اپنی بیوی کا عاشق بن گیا تھا۔ اور پھر سے جوان ہونے لگا تھا۔
اسے اتنا سکھ زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اس کا ایک پل بھی زیتون کے بغیر جی نہ لگتا تھا۔ ورکشاپ میں وہ اپنے سارے کاریگر دوستوں کے سامنے اپنی بیوی ہی کے گن گاتا رہتا۔ کاریگر اسے مذاق بھی کرتے اس کا تمسخر بھی اڑاتے مگر وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ اس کی زندگی میں ایسا خوشگوار انقلاب آ گیا تھا کہ اس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔
زیتون نے بھی اپنی پچھلی زندگی کے تلخ حادثات کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ اور ایک نیا جنم لے لیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی ماحول میں رہ رہی ہے۔
اور وہ زیتون کوئی دوسری عورت تھی جو جگہ جگہ بردہ فروشوں کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی۔ چھ ماہ بڑی خوشی اور اطمینان سے گزر گئے۔ اس دوران میں زیتون کی کبیر سے بھی کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ اس نے اس کی ضرورت بھی کبھی محسوس نہ کی۔ کبیر نے ایک اچھا کام کر دیا تھا۔ اب زیتون اچھائی کے اس راستے پر پوری توجہ، سنجیدگی اور متانت سے گامزن تھی۔

ایک سال گزر گیا۔ زیتون ہر اعتبار سے اپنے گھر میں خوش تھی۔ اگر کوئی کمی تھی تو صرف یہ کہ اس کے ہاں بچہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے کئی عورتوں سے مشورہ کیا۔ کئی تعویذ پانی میں گھول کر پئے۔ آخر وہ اپنے خاوند کے ساتھ ایک زنانہ ہسپتال گئی۔ ڈاکٹرنی نے اس کا پورا معائنہ کیا اور کہا کہ اس کے اندر خرابی پیدا ہو گئی ہے اور بچے کی امید قریب قریب ناممکن ہے زیتون اداس ہو گئی۔ ڈاکٹرنی نے کہا۔

"علاج پر کافی روپیہ خرچ آئے گا۔ پھر بھی روپے میں سے صرف ایک آنے کامیابی کی توقع ہے۔"

زیتون اپنے خاوند کے ساتھ دل برداشتہ ہو کر واپس گھر آ گئی۔ مستری فیروز دین نے اسے تسلی دی کہ اگر خدا کی مرضی ہوئی تو اس کی گود ضرور ہری ہو جائے گی۔ اس دن سے نماز پڑھ کر روز خدا کے حضور میں بچے کے لئے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔
چھ ماہ اور گزر گئے۔

زیتون نے اپنی سوتیلی لڑکیوں کو ہی اپنی اولاد سمجھ لیا اور ان سے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح محبت کرنے لگی۔ سردیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک روز زیتون گھر میں چارپائی پر بیٹھی اپنی چھوٹی لڑکی کے کرتے سی رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کی نسواری برقعے والی عورت سلام کر کے اندر آ گئی۔ زیتون کمرے میں اکیلی تھی۔ اس کی دونوں لڑکیاں اوپر دھوپ میں بیٹھی شلغم سکھانے کے لئے ان کے قتلے کاٹ کر ہاروں میں پرو رہی تھیں۔ خاوند ورکشاپ میں گیا ہوا تھا اور سسر اپنے دوست کی دوکان پر جا چکا تھا۔

زیتون نے نووارد عورت کا چہرہ دیکھا تو اسے اپنے برے زمانے کے دیکھے ہوئے چہرے یاد آ گئے۔ ڈھلتی عمر لیکن ہونٹوں پر لپ سٹک ماتھے پر کٹی ہوئی لٹ۔ کانوں میں سونے کے بندے۔ منہ میں پان۔ آنکھوں میں سرمہ اور جسم پر ریشمی سوٹ جس کا گریبان کھلا تھا۔ زیتون نے کرتہ ایک طرف رکھ دیا اور اسے بیٹھنے کو پیڑھی دی۔
عورت نے ناک چڑھا کر کمرے کا جائزہ لیا اور پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

عورت نے پان ایک کلے سے دوسرے کلے میں دباتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام زیتون ہے ناں۔"

"جی ہاں --- فرمائیے کیا کام ہے آپ کو؟"

عورت پیڑھی سے اٹھ کر زیتون کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور ذرا جھک کر بولی۔

"تم اتنی غریبی میں اپنی جوانی کیوں برباد کر رہی ہو؟"

زیتون ایک دم پرے ہٹ گئی۔

"کیا مطلب؟"

عورت نے مسکرا کر کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ تجھ میں کس چیز کی کمی ہے۔ تم اگر چاہو تو دولت تمہارے قدم چوم سکتی ہے۔ آخر تم اس اندھے کنوئیں میں کیسے گر پڑیں؟"

زیتون نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

"آپ کو ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں"۔

عورت نے مسکرا کر کہا۔

"جانتی ہو مجھے کس نے بھیجا ہے؟"

"کسی نے بھیجا ہو۔ میں آپ سے ایسی باتیں سننے کو تیار نہیں ہوں اگر آپ کو یہی باتیں کہنا ہیں تو آپ تشریف لے جائیں۔"

عورت نے بھنوئیں ترچھی کرلیں۔ اور ترش ہو کر بولی۔

"تو پھر سنو! میں جانتی ہوں تم کون ہو تم کہاں سے آئی ہو اور کیا کیا کرتی رہی ہو۔ مجھے کارخانہ دار قریشی نے بھیجا ہے۔ وہی قریشی جس کے پاس تم سمن آباد میں شاہدہ کے گھر ایک رات گذار چکی ہو۔"

زیتون کو گویا سکتہ سا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ سرد ہو کر سفید پڑ گئے اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی مدت گذر جانے پر اور زندگی اتنی خوشگوار ہو جانے کے بعد کبھی کوئی اس کے گلستان میں آگ لگا سکتا ہے۔ عورت بولے جا رہی تھی۔

"جن لوگوں سے تم بھاگ کر آئی ہو انہیں تمہارے ٹھکانے کا علم ہو گیا ہے۔ وہ اگر چاہتے تو تمہیں یہاں سے اٹھا کر لے جاتے۔ وہ ایک منٹ کے اندر اندر تمہارے خاوند کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں اور اس کی لاش کو ایسی جگہ غائب کر سکتے ہیں جہاں سے ہزاروں سال تک کسی کو کھوج نہیں لگ سکتا۔ لیکن کارخانہ دار قریشی صاحب نے انہیں روک کے رکھا ہے۔ اس لئے کہ وہ غنڈے ان کے اپنے آدمی ہیں۔"

زیتون پر بجلی سی گر پڑی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "تم جھوٹ

بول رہی ہو۔ ایسا --- ایسا نہیں ہو سکتا"۔

عورت ہنس پڑی۔

"اگر تماشہ دیکھنا چاہتی ہو تو کل ہی دیکھ لینا۔ کل رات ہونے سے پہلے غنڈے تمہارے خاوند کو قتل کر دیں گے اور تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔ اب ان کے چنگل سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ قریشی صاحب جو کہتے ہیں وہ بات منظور کر لو"۔

"کونسی بات؟"

"تمہیں ہر تیسرے روز دوپہر کو ان کی نئی کوٹھی میں جا کر ان کا دل خوش کرنا ہو گا۔ اگر تم نے یہ شرط منظور نہ کی تو اس کا انجام انتہائی خوفناک ہو گا۔ قریشی صاحب صرف تمہارے خاوند کو ہی تمہاری گزشتہ زندگی کا قصہ نہیں بتا دیں گے۔ بلکہ ان غنڈوں کو بھی اجازت دے دیں گے کہ وہ اپنی من مانی کرتے پھریں اور اس طرح تمہارا گھر ہی برباد نہیں ہو گا۔ بلکہ خاوند بھی مارا جائیگا۔ اور تم در بدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرو گی۔ میں تمہیں صرف یہی کہنے آئی تھی۔ میں جا رہی ہوں۔ اگر یہاں بیوی بن کر سکھ سے رہنا چاہتی ہو تو کل اس وقت سمن آباد کی کوٹھی نمبر.... میں پہنچ جانا اچھا سلاواں لیکم!"

اتنی بات کر کے عورت تو چلی گئی لیکن زیتون کے سر پر گویا مکان کی چھت گر پڑی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر مبہوت سی ہو کر بیٹھی رہی۔ ایک منٹ پہلے جس گھر میں ہر طرف مسرتوں اور خوشیوں کے نقارے بج رہے تھے۔ اب اس کی ایک ایک دیوار گر رہی تھی اور زیتون کے ارمانوں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اوپر سے اس کی بڑی لڑکی نے آواز دی۔

"امی شلغم ختم ہو گئے ہیں۔ بازار سے اور منگوا لیں؟"

زیتون کو یہ آواز بڑی اجنبی لگی۔ جیسے کسی دوسری دنیا سے آ رہی ہو۔ شام کو اس کا خاوند ورکشاپ سے واپس آیا تو وہ اس بچے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی جس کے باپ کا جنازہ اس کی معصوم آنکھوں کے سامنے اٹھایا جا رہا ہو۔ اس نے روز سے زیادہ محبت کے ساتھ اسے روٹی ڈال کر دی۔ منہ ہاتھ دھلایا۔ دھوتی اور قمیض اندر سے لا کر دی۔ اس کے ڈبے کو خود صاف کیا۔ اس کی مٹھیاں بھریں۔ اور رات کو اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔

"کیا ہوا زیتون ؟ خیر تو ہے ؟"

زیتون نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"یونہی آپ کی محبت دیکھ کر جی بھر آیا۔ میں آپ کے لائق نہ تھی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو زیتون ! میں تو خوش قسمت آدمی ہوں جو مجھے تم ایسی بیوی مل گئی۔ میرا گھر تو ویران تھا۔ اسے تم نے تو آباد کیا ہے۔ اس گھر میں اتنی خوشیاں اور اتنی رونق پہلے کہاں تھی!"

ان باتوں سے زیتون کا جی اور بھر آیا۔ اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

جانے کس وقت خاوند کے ساتھ لگے روتے روتے اسے نیند آ گئی صبح وہ اٹھی تو اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ آج دوپہر اگر وہ اوباش کارخانہ دار کے پاس نہ گئی تو اس کی گھریلو زندگی کے سارے ستون ایک ایک کر کے گر پڑیں گے اور وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ اس کے باوجود وہ اپنے خاوند کو دھوکہ دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے خاوند کو خود ہی سب کچھ بتا دے گی۔ لیکن اس کے اعتماد کا گلا نہیں کاٹے گی۔ لیکن --- وہ لوگ غنڈے ہیں۔ وہ اسے ہلاک کر دیں گے زیتون کانپ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جن لوگوں کے چنگل سے وہ بھاگ کر نکلی تھی۔ وہ کتنے بے رحم اور سنگدل لوگ ہیں اور وہ کیا نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اچانک اسے اپنی سہیلی شاہدہ کا خیال آ گیا۔ اسے شاہدہ سے جا کر فریاد کرنی چاہیے۔ کارخانہ دار اس کا دوست ہے۔ اسے شاہدہ سے جا کر مشورہ کرنا چاہیے۔ کہ وہ کارخانہ دار سے اس کی سفارش کرے اور اس کے پرسکون گھر کو تباہ ہونے سے بچا لے۔

زیتون نے برقعہ اوڑھا اور ہسپتال تک جانے کا بہانہ بنا کر گھر سے نکلی اور بس میں سوار ہو سیدھی سمن آباد آ گئی۔ وہ شاہدہ سے جاتے ہی لپٹ گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ شاہدہ حیران ہو کر رہ گئی۔ اسے اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ زیتون نے شادی کر لی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سے کبھی نہیں ملی تھی۔ وہ سمجھی شاید اس کے خاوند نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ جب زیتون نے روتے ہوئے اسے پوری بات سنائی تو شاہدہ سوچ میں پڑ گئی۔ زیتون نے گڑگڑا کر شاہدہ سے التجا کی کہ وہ اس کی گھریلو زندگی کو تباہی کے غار سے بچا لے۔ شاہدہ نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے زیتون میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ قریشی بڑا ذلیل آدمی

ہے اور وہ غنڈے واقعی اس کے اپنے آدمی ہیں۔ اس نے تو اب مجھ سے بھی ملنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن جب وہ بلاتا ہے تو مجھے جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ غنڈوں کا سرغنہ ہے اور ان پر ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ اس نے تمہیں بلایا ہے تو تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ تم اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی ہو"۔

زیتون نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔

"میں پولیس کو اطلاع کر دوں گی"۔

"اس سے معاملہ اور خراب ہو جائے گا۔ تمہارا خاندان تمہیں فوراً چھوڑ دے گا۔ کوئی شریف خاندان یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی کے تھانوں میں چرچے ہوں اور وہ بھی اس الزام میں کہ اس کی بیوی پیشہ کروایا کرتی تھی۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ اگر تمہیں اپنے گھربار کا سکھ اور گھریلو زندگی کا ماحول عزیز ہے تو چپکے سے قریشی کی بات مان لو وہ بات کا پکا آدمی ہے۔ تم اس کے پاس ہفتہ میں ایک آدھ بار چلی جاؤ گی تو وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا اور تمہارا گھر تباہ ہونے سے بچ جائے گا"۔

زیتون کے کلیجے میں چھریاں چل رہی تھیں۔ اسے شاہدہ سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔ مگر اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا تھا اور اسے ایسا مشورہ دیا تھا جس پر عمل کرنے سے اس کے خاوند کی زندگی اور اس کا گھریلو سکون محفوظ رہتا تھا۔ مگر اس کی اپنی شخصیت کے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ زیتون کا دماغ سنسنا رہا تھا آخر وہ اٹھی اور برقعہ اوڑھ کر شاہدہ کے گھر سے باہر نکل آئی۔

باہر آ کر اس نے وہ راستہ پکڑ لیا جو کارخانہ دار قریشی کی کوٹھی کو جاتا تھا۔ وہ یوں چلی جا رہی تھی جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اسے اپنے تن بدن کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں اکیلا رہتا ہو گا۔ ورنہ وہ کبھی زیتون کو وہاں نہ بلاتا۔ زیتون نے گھنٹی بجائی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ اور زیتون کو دیوان خانے میں بٹھلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا کارخانہ دار اندر آ گیا اور فتح مندی کے ساتھ مسکرا کر زیتون کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی۔ تم بڑی سمجھدار عورت ہو"۔

زیتون نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟ کیا تم میری زندگی پر ترس نہیں کھا سکتے؟ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان فراموش نہیں کروں گی"۔

کارخانے دار نے یہ قہقہہ لگایا اور زیتون کی گردن پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"مجھ پر ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ میں تمہارے جسم کا عاشق ہوں اور جس چیز پر میں عاشق ہوتا ہوں۔ اسے حاصل کر کے چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے میری خواہش کے مطابق عمل نہ کیا تو اس کے انجام سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ اب برقعہ اتار دو اور میرے ساتھ ساتھ والے کمرے میں آ جاؤ۔ وہاں بہترین شراب اور گرم بستر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

زیتون کا سر جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ کارخانہ دار اتنا کہہ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

"میں صرف پانچ منٹ تمہارا انتظار کروں گا۔ اس کے بعد یہاں وہ لوگ پہنچ جائیں گے۔ جن سے بھاگ کر ایک رات تم گھر سے نکل گئی تھیں۔ اور یاد رکھو اب تم ان کے چنگل سے ساری عمر نجات حاصل نہ کر سکو گی۔ اگر میرے پلنگ پر آ جایا کرو گی تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ تمہارا گھر بھی محفوظ رہے گا اور تمہیں بھی کوئی کچھ نہ کہے گا۔ میں ساتھ والے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

زیتون دیوان خانے میں بیٹھی روتی تھی۔ وہاں اسے تسلی دینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے سوائے کارخانہ دار کی خوابگاہ کو جانے کے اور کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ پرانی ہولناک زندگی کی دلدل میں وہ گرنا نہیں چاہتی تھی اور نئی شریفانہ زندگی کی پر سکون وادیوں کو وہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ اس نے اچانک دل میں ایک فیصلہ کیا۔ گردن اوپر اٹھا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ برقعہ اتارا۔ دوپٹہ اور قمیض اتار کر صوفے پر رکھی اور کارخانے دار کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

ہفتے میں دو دن پوری باقاعدگی سے زیتون کو کارخانہ دار کی کوٹھی میں اپنے گھر کی لاج بچانے کے لئے اپنی لاج لٹانے آنا پڑتا۔ اس نے خاوند کو یہ کہہ دیا کہ وہ ہسپتال میں بچے کے علاج کے سلسلے میں جاتی ہے خاوند اس پر کبھی شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن محلے والے کبھی ایسے حالات میں چین سے نہیں بیٹھا کرتے۔ وہ پہلے ہی حیران تھے کہ بوڑھے مستری نے جوان لڑکی سے شادی رچا لی ہے۔ پھر کوئی شوشہ کیوں

نہیں چھٹتا۔ یہ لڑکی اتنی شریف کیسے ہو سکتی ہے کہ بوڑھے خاوند کے ساتھ لگ کر ساری جوانی برباد کرے۔ چنانچہ جب زیتون ہفتے میں دوبار بڑی باقاعدگی کے ساتھ گھر سے نکلنے لگی تو محلے کے منچلے نوجوانوں نے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر ایسی باتیں کبھی چھپی نہیں رہا کرتیں۔ آج کل کے زمانے میں تو کسی کی نیکی بھی نہیں چھپتی اور برائی تو کسی زمانے میں بھی چھپ نہیں سکی۔ محلے والوں کو معلوم ہو گیا کہ مستری فیروز دین کی جوان بیوی خاوند سے چھپ کر قریشی کارخانے دار سے ملنے اس کی کوٹھی جاتی ہے جو ایک اوباش آدمی ہے اور چوبیس گھنٹے شراب کے نشے میں رہتا ہے۔ محلے میں گھر گھر بدنامی شروع ہو گئی۔ عورتوں نے مستری فیروز دین کی بہنوں کے جا کر کان کھانے شروع کر دیئے۔ اور مردوں نے مستری فیروز دین کا تمسخر اڑانا اور اس پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔

زیتون کو ان باتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اتنی شریف بن چکی تھی کہ گھر کے سکھ چین اور اپنے خاوند کی زندگی کے لئے وہ اس زنا کاری کو بھی ایک ازدواجی فرض سمجھ کر پوری طرح ادا کر رہی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک انتہائی مذموم حرکت کر رہی ہے۔ اور آگ سے کھیل رہی ہے۔ مگر وہ اپنے خاوند اور اپنے گھر کی محبت میں پاگل سی ہو کر یہ کام کر رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلے کے کچھ لوگوں نے ایک روز مستری فیروز دین کو جا کر سمجھایا کہ وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے کیوں پڑا ہے جب کہ اس کے گھر میں اس کی عزت و آبرو لٹ رہی ہے۔ مستری کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب اس کی بہنوں نے بھی اسے لعن طعن کی تو حیران اور پریشان ہو کر رہ گیا۔ بہنوں نے کہا۔

"اس حرامزادی کو فوراً طلاق دے دو۔ ہم ایسی کنجری کو ایک منٹ بھی گھر میں نہیں رکھ سکتے۔"

مستری نے بھول پنے سے کہا۔

"لیکن کوئی ثبوت بھی تو ہو"۔

چنانچہ بیوقوت مستری کی بہنوں نے زیتون کو بتائے بغیر اور اس سے لڑے جھگڑے بغیر یہ پروگرام بنایا کہ ایک روز اس کا پیچھا کیا جائے۔ ایک روز جب زیتون حسب وعدہ اپنے گھر سے باہر نکلی تو پیچھے پیچھے مستری کی دونوں دنیا دار بہنیں اپنے بھائی

یعنی فیروز دین مستری کو ساتھ لے کر چل پڑیں۔ مستری یوں ساتھ جا رہا تھا جیسے وہ ورکشاپ کام پر جا رہا ہو۔ صرف کبھی کبھی وہ سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر دل ہی دل میں یہ کہہ لیتا۔

"نہیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

انہوں نے دیکھا کہ زیتون کارخانہ دار کی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ دونوں بہنوں اور مستری نے کچھ دیر کوٹھی کے باہر ایک طرف انتظار کیا اتنی دیر تک وہ زیتون کو گالیاں دیتی رہیں اور کانوں کو بار بار ہاتھ لگاتی رہیں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد دونوں چالاک عورتیں اپنے بیوقوف بھائی کو ساتھ لے کر کوٹھی کے اندر زناٹے سے داخل ہو گئیں۔ انہوں نے دیوان خانے کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ اندر کا منظر یہ تھا کہ زیتون آنکھیں بند کئے کارخانے دار قریشی کی گود میں پڑی تھی اور وہ صوفے پر دراز اس کے ننگے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

بہنوں نے اندر جاتے ہی سیاپا شروع کر دیا۔ اور زیتون کو گالیاں اور بد دعائیں دینا شروع کر دیں۔ زیتون کے خاوند مستری فیروز دین کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ وہ تو پتھر کا بت بنا اسے دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ کارخانے دار شراب کے نشے میں تھا۔ پھر بھی وہ سمجھ گیا کہ زیتون کے گھر والے آ گئے ہیں۔ چونکہ وہ اپنی جگہ پر مضبوط تھا۔ اس لئے خاموش لیٹا رہا۔ زیتون کا سارا جسم سرد پڑ گیا۔ رنگ زرد ہو گیا اور اس نے اپنے خاوند کو دیکھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گئی۔ دونوں بہنیں روتی پیٹتی گالیاں دیتی اپنے احمق بھائی کو گھسیٹ کر باہر نکل گئیں اور یہ کہہ گئیں۔

"اب اسی یار کے پاس رہنا۔ تجھے آج ہی طلاق یہاں پہنچ جائے گی۔"

اور اسی روز کارخانہ دار کی کوٹھی میں زیتون کو طلاق نامہ مل گیا۔ زیتون ہوش میں آ چکی تھی۔ اس نے طلاق نامہ دیکھ کر ایک چیخ ماری اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

....

ایک ہفتے کے بعد کبیر کو اس حادثہ جانکاہ کا علم ہوا تو اسے بہت افسوس ہوا۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ اسے مستری فیروز دین کی بے وقوفی کی انمول اچھائی اور خدائی نعمت پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اسے اس کے

گھر والوں اور محلے داروں پر اعتماد نہیں تھا۔ بیوقوفوں کے گھروں کو ہمیشہ دنیا دار لوگوں نے تباہ کیا ہے۔

اور ایسا ہی ہوا ۔ زیتون کا گھر اجڑ گیا۔ اس کی زندگی ویران ہو گئی۔ سمندر کی تلاش میں نکلی ہوئی صحرائی نہر ایک بار پھر صحراؤں کی ریت میں جذب ہو کر رہ گئی۔ فیروز دین کی سادگی نے اس کا اجڑا ہوا گھر آباد کیا اور اسی سادگی نے اس کے گھر کے سکون کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ وہ مستری سے ملا تو اس نے دیکھا کہ وہ دنوں میں بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کا چہرہ جھریوں سے لٹک گیا ہے۔ آنکھوں میں ناقابل بیان اذیت اور کرب جھانک رہا ہے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ جسم جھک گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی مردہ ہے جو قبر سے تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل آیا ہے۔ اس نے کبیر سے کوئی بات نہ کی۔ صرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر سر جھکا کر کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کبیر چپکے سے ورکشاپ سے باہر نکل آیا۔

اس کے بعد نہ تو وہ مستری فیروز دین سے کبھی ملا اور نہ اس نے زیتون ہی کو پھر کہیں دیکھا۔ کوئی چھ ماہ بعد اسے خبر ملی کہ مستری فیروز دین کا انتقال ہو گیا ہے۔ کبیر کو اس کا دکھ ہوا۔ لیکن اس نے سوچا کہ موت ہی اس بدنصیب شخص کے دکھوں کا علاج تھی۔ ایسے انسان کو ہمارے انصاف دشمن معاشرے میں صرف موت ہی اپنی گود میں پناہ دے سکتی ہے۔ وقت گذرتا چلا گیا۔ ایک سال' دو سال تین سال گذر گئے۔ لوگ مستری فیروز دین' اس کے المیے اور زیتون کو بھول گئے۔ ویسے یہ لوگ زمانے کو پہلے بھی کیا یاد تھے۔ کبیر اپنی پرانی ڈگر پر چلتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ قرض لے کر ایک قرض اتارتا اور اسے اتارنے کے لئے پھر کہیں سے قرض پکڑ لیتا۔ اس کی ساری زندگی کسی سے مانگا ہوا قرض تھی جسے وہ مرتے دم تک اتارنے کا عہد کیے ہوئے تھا۔ وہ رباب امرتسری کے ساتھ بیٹھ کر بھینسے ایڈیٹر کے دفتر میں بیڑا اڑاتا ۔ اس کے سگریٹ پیتا۔ ان کی گالیاں سنتا۔ انہیں گالیاں دیتا اور زندگی کی گاڑی کو دھکے دے کر چلائے چلے جاتا۔ ایک روز وہ بھینسے ایڈیٹر کے فلمی اخبار کے دفتر میں داخل ہوا تو اسے بند کمرے کے پیچھے سے عورتوں کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں کبھی کوئی پردہ دار شریف عورت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ کبیر نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر رباب امرتسری اور بھینسا ایڈیٹر تین عورتوں کے ساتھ مل

کر بیئر پی رہے تھے۔ ایڈیٹر اور رباب امرتسری نے ایک نعرہ مستانہ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ عورتوں نے بھی مسکرا کر نشیلی آنکھوں سے کبیر کو دیکھا۔ اچانک کبیر گلاس میں اپنے لئے بیئر انڈیلتے ہوئے رک گیا۔ اس نے بیئر کی بوتل واپس میز پر رکھ دی اور ایک عورت کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

یہ عورت دو عورتوں کے درمیان میں بیٹھی تھی۔ اور بیئر کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں بڑی نفاست سے پکڑا ہوا سگریٹ سلگ رہا تھا۔ وہ عورت بھی کبیر کو مسلسل دیکھ رہی تھی اور اس کا ایک منٹ پہلے مسکراتا چہرہ سکڑ کر سمٹ سا گیا تھا۔ کبیر نے اسے پہچان لیا۔ وہ آہستہ سے اس کی طرف جھکا اور بولا۔

"زیتون! ساتھ والے کمرے میں میری ایک بات سنو گی؟"

زیتون نے ذرا سا مسکرا کر گلاس میز پر رکھ دیا ۔ سگریٹ کا گل جھاڑا' اپنی پھنسی ہوئی بیش قیمت ریشمی قمیص کے بل درست کرتی اٹھی اور کبیر کیساتھ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اس کے پیچھے رباب امرتسری اور بھینگے ایڈیٹر نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"کہتے آتے ہی عورت پر حملہ کر دیا۔ لے گیا سالا میری معشوقہ کو -- ہائے میری پکھراج ......"

دوسرے کمرے میں داخل ہو کر کبیر نے دروازہ بند کر لیا۔ زیتون اس کے سامنے قیمتی کپڑوں میں ملبوس شراب کے سرور میں ہلکے ہلکے جھوم سی رہی تھی۔ یہ وہ زیتون نہیں تھی بلکہ اس کا ڈھانچہ تھا۔ اس میں سے زیتون کو تلاش کرنا پڑتا تھا۔ وہ بڑی دبلی پتلی ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ چہرہ لمبوترا ہو گیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ چہرے پر ایک عجیب قسم کی مردنی سی چھا گئی تھی۔ رخساروں پر چھائیاں سی پڑ گئی تھیں۔ لیکن وہ بہترین لباس پہنے ہوئے تھی اور اس نے سرخی پاؤڈر بری طرح تھوپ رکھا تھا۔ کبیر نے کہا۔

"زیتون! تمہیں کیا ہو گیا؟"

زیتون نے سگریٹ کا کش لگایا اور ذرا سا مسکرا کر بولی۔

"اول تو میرا نام زیتون نہیں پکھراج ہے۔ زیتون ایک عرصہ ہوا مر چکی ہے۔ میں نے حسن آباد سے خود اس کا جنازہ اٹھتا دیکھا ہے۔ پکھراج زندہ ہے اور جب زندہ

ہے پوری طرح زندہ رہے گی۔ زیتون مر گئی ہے اور ہمیشہ کے لئے مر گئی ہے۔ کوئی اور بات؟"

"کوئی نہیں"۔

زیتون نے بڑی شان بے نیازی سے سگریٹ کا کش لگایا اور مسکراتی ہوئی نشے میں کچھ جھومتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کبیر کچھ دیر اکیلا کمرے میں کھڑا فرش کو تکتا رہا۔ پھر وہ بھی باہر نکل گیا۔ ایڈیٹر کے کمرے کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے زیتون کے قہقہے کی آواز سنی اور زندگی میں شاید پہلی بار کبیر کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس نے اتنی درد بھری چیخ پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ وہ چپکے سے دفتر سے باہر آ گیا۔ باہر میکلوڈ روڈ کی رات شور سے بھرپور تھی۔ لیکن کبیر کو یوں محسوس ہوا جیسے سارا شہر سنسان ہو گیا ہے۔ ساری رات ویران ہو گئی ہے۔ اور اس ہولناک سناٹے میں سوائے ایک دلدوز قہقہے کے ایک دلفگار چیخ کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ وہ سر جھکائے ایبٹ روڈ کی طرف چل پڑا۔ شملہ پہاڑی کی طرف غمگین سوگوار' پیلا چاند طلوع ہو رہا تھا۔